Regd. L. No. 7243 Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

# طلوعِ اسلام

مئی 1977

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔بی۔ گلبرگ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ پچاس پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

# ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

| قیمت فی پرچہ | ٹیلی فون نمبر | بدل اشتراک |
| --- | --- | --- |
| ۱½ ڈیڑھ روپیہ | ۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۔ گلبرگ ۲۵-بی لاہور | سالانہ پاکستان ۔۔۔۔۔ ۱۸/ روپے غیر ممالک ۔۔۔۔۔ ۳ پونڈ |
| شمارہ ۵ | مئی ۱۹۷۷ء | جلد ۳۰ |


## فہرست

۱۔ لمعات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲

۲۔ اسلامی مملکت کا تصور ۔۔۔ اقبالؒ کے نزدیک ۔۔۔ (محترم پرویز صاحب) ۔۔ ۱۷

۳۔ اوراقِ گم گشتہ ، متفاولِ اقبالؒ ۔۔۔۔ (محترم پرویز صاحب) ۔۔۔ ۴۱

۴۔ بزمِ مذاکرہ (قسط ۳) ۔ (منعقدہ طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۶ء) ۔۔۔ ۵۶

ایڈیٹر محمد خلیل ۔ ناشر سراج الحق ۔ مقامِ اشاعت ۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور ۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد مطبوعہ ۔ علمی پرنٹنگ پریس لیک ٹن ہسپتال روڈ ۔ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

# لمعات

(۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی یاد میں)

طلوعِ اسلام کا حالیہ شمارہ چونکہ حکیم الامت، علامہ اقبالؒ کی یاد میں شائع کیا جا رہا ہے، اس لئے اس کے لمعات بھی انہی کی نگارشات کی نذر ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:-

## (۱) قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں

عرشی صاحب[1] کا بیان ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ علامہ اقبالؒ سے پوچھا کہ: "خارج از قرآن ذخیرۂ احادیث و روایات اور کتبِ فقہ وغیرہ کو شامل کر کے اسلام مکمل ہوتا ہے یا صرف قرآن اس باب میں کفایت کرتا ہے"؟ انہوں نے فرمایا: "یہ چیزیں تاریخ و معاملات پر مشتمل ہیں۔ ان کی بھی ضرورت ہے اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ کن ضروریات کے ماتحت وضع کی گئیں، لیکن نفسِ اسلام قرآن مجید میں بکمال و تمام آچکا ہے۔ خداوند تعالیٰ کا منشا دریافت کرنے کے لئے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔"

(البیان - دسمبر ۱۹۲۹ء)

## (۲) احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کیا جائے

مجھ کو اُن[2] کے خیالات سے کسی حد تک پہلے بھی آگاہی ہے۔ کیا اچھا ہو کہ وہ شریعتِ محمدیہ پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں۔ جس میں عبادات و معاملات کے متعلق صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو۔ معاملات کے متعلق خاص طور پر اس قسم کی کتاب کی آجکل شدید ضرورت ہے، ہندوستان میں تو شاید اس کے مقبول ہونے کے لئے مدت درکار ہے، ہاں دوسرے اسلامی ممالک میں اس کی ضرورت کا احساس روز بروز بڑھ رہا ہے۔ شیخ علی رزاق اور دوسرے علمائے مصر کے مباحث سے مولوی صاحب آگاہ ہوں گے

(۱) خواجہ احمد الدین صاحب (امرتسری) مرحوم۔

علیٰ ہذا القیاس ترکی میں بھی یہی مسائل زیرِ غور ہیں۔ اس پر ایک آدھ کتاب بھی تصنیف ہو چکی ہے۔ اس میں زیادہ تر زمانۂ حال کے مغربی اصولِ فقہ کو ملحوظ رکھ کے فقہ اسلامی پر بحث کی گئی ہے۔ ترکوں نے جو "چرچ اور سٹیٹ" میں امتیاز کر کے ان کو الگ کر دیا ہے۔ اس کے نتائج نہایت دور رس ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ افتراق اقوامِ اسلامی کے لئے باعثِ برکت ہوگا یا شقاوت۔ غرضکہ مولوی صاحب یا ان کے رفقاء کو جو کلام الٰہی اور مسائل کے دیگر مذہبی لٹریچر پر عبور رکھتے ہیں' اس طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ میں اور مجھ ایسے اور لوگ صرف ایک آنکھ رکھتے ہیں۔ ایک مدت سے ہم یہ سنتے رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ رسالہ بلاغ امرتسر کے ہر نمبر میں اور مولوی حشمت علی صاحب کے رسالہ اشاعت القرآن٭ کے ہر نمبر میں اسی پر بحث ہوتی ہے لیکن ضرورت ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادتِ انسانی کیلئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔ نیز جو جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص مؤخر الذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت تک مروّج ہیں۔ ان پر قرآنی نقطۂ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوعِ انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے "جورس پروڈنس" یعنی اصولِ فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا۔ وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔ قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں یا قوانینِ اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں (سوائے ایران و افغانستان کے) مگر ان ممالک میں بھی امروز فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے مگر افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدینِ شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت پسندی نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکامِ قرآنی کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کا نظیر ناممکن ہے۔ غرضکہ یہ وقت عملی کام کا ہے' کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہبِ اسلام گویا زمانہ کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے۔ اور شاید تاریخِ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔

(مکتوب بنام صوفی غلام مصطفےٰ تبسم۔ محررہ ۲ ستمبر ۱۹۲۵ء)

## (۳) مسلمانوں کا نصب العین

انسان کی تاریخ پر نظر ڈالو، ایک لامتناہی سلسلہ ہے باہم آویزشوں کا، خونریزیوں کا اور خانہ جنگیوں کا۔ کیا ان حالات میں عالمِ بشری میں ایک ایسی اُمّت قائم ہو سکتی ہے جس کی اجتماعی زندگی امن و سلامتی پر موسس ہو؟ قرآن کا جواب ہے کہ ہاں ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ توحیدِ الٰہی کو انسانی فکر و عمل میں حسبِ منشاءِ الٰہی مشہود کرنا انسان کا نصب العین قرار پائے۔ ایسے نصب العین کی تلاش اور اس کا قیام سیاسی تدبیر کا کرشمہ نہ سمجھئے' بلکہ یہ رحمۃ للعالمین کی ایک شان ہے کہ اقوامِ بشری کو ان کے تمام خود ساختہ تفوّقوں اور فضیلتوں سے پاک

٭ یہ ان بیچاروں کے بس کی بات نہ تھی۔ نہ ہے۔ ان کے نزدیک قرآن یہ بتانے کیلئے ہی آیا تھا کہ انڈا حلال ہے یا حرام (طلوعِ اسلام)

کرکے ایک ایسی امّت کی تخلیق کی جائے جس کو امۃ مسلمۃ لک کہہ سکیں اور اس کے فکر و عمل پر شہداء علی الناس کا خدائی ارشاد صادق آسکے۔ (مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں۔ متعلقہ قومیت)

---

## (۴) اسلام رنگ و نسل و جغرافیہ سے بلند ہو کر انسانیت کو دعوت دیتا ہے

(۱) اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدہ کا، جو نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگِ گراں ہے، نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ دنیا ان کا یہ خیال غلط ہے کہ سائنس اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے، در اصل اسلام، بلکہ کائناتِ انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوعِ انسانی سے محبت رکھتے ہیں، ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدود و مالک پر ہے، دنیائے اسلام میں استیلاء حاصل کر رہا ہے۔ اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کرکے اس عقیدہ کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدردِ نوعِ انسانی کی حیثیت سے انہیں یہ یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشو و ارتقاء ہے۔ نسل اور حدودِ ملک کی بنیاد پر قبائل اور اقوام کی تنظیم حیاتِ اجتماعی کی ترقی اور تربیت کا ایک وقتی اور عارضی پہلو ہے۔ اگر اسے یہی حیثیت دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن میں اس چیز کا مخالف ہوں کہ اسے انسانی قوتِ عمل کا مظہرِ اتم سمجھ لیا جائے۔

یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے بے حد محبت ہے لیکن مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال صحیح نہیں کہ میں نے محض اس محبت کے پیشِ نظر مسلمانوں کو اپنا مخاطب ٹھہرایا ہے، بلکہ در اصل عملی حیثیت سے میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ایک خاص جماعت یعنی مسلمانوں کو اپنا مخاطب قرار دیا جائے، کیونکہ تنہا یہی جماعت میرے مقاصد کے لئے موزوں واقع ہوئی ہے۔ مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال بھی تسامح سے خالی نہیں کہ اسلامی تعلیمات کی روح کسی خاص گروہ سے مختص ہے۔ اسلام تو کائناتِ انسانیت کے اتحادِ عمومی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کے تمام جزوی اختلافات سے قطعِ نظر کر لیتا ہے اور کہتا ہے۔ تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم۔

(ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب۔ متعلقہ "فلسفۂ سخت کوشی")

---

(۲)

اسلام کے مذکورہ بالا دعوے پر عقلی دلائل کے علاوہ تجربہ بھی شاہد ہے۔ اول یہ کہ اگر عالمِ بشریت کا مقصد اقوامِ انسانی کا امن، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظامِ اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آ سکتا، کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالمِ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے، جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں

خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ تاریخ ادیان اس بات کی شاہد و عادل ہے کہ قدیم زمانہ میں "دین" قومی تھا، جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا، بعد میں نسلی قرار پایا۔ جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ عقائد کا نام ہے۔ اس واسطے انسان کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف اسٹیٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوعِ انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی نہ انفرادی نہ پرائیویٹ بلکہ خالصتہً انسانی ہے۔ اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالمِ بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ ایسا دستور العمل قوم اور نسل پہ بنا نہیں کیا جا سکتا، نہ اس کو پرائیویٹ کہہ سکتے ہیں، بلکہ اس کو صرف معتقدات پہ مبنی کیا جا سکتا ہے، صرف یہی ایک طریق ہے جس سے عالمِ انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے جو ایک امت کی تشکیل اور اس کے بقا کے لئے ضروری ہے۔ کیا خوب کہا ہے مولانا رومیؒ نے: ؎

ہم دلی از ہم زبانی بہتر است!

اس سے علیحدہ ہو کر جو اور راہ اختیار کی جائے وہ راہ لادینی کی ہوگی اور شرفِ انسانیت کے خلاف ہوگی۔ چنانچہ یورپ کا تجربہ دنیا کے سامنے ہے۔ جب یورپ کی دینی وحدت پارہ پارہ ہوگئی اور یورپ کی اقوام علیحدہ علیحدہ ہوگئیں تو ان کو اس بات کی فکر ہوئی کہ قومی زندگی کی اساس کیا قرار پائے۔ ظاہر ہے کہ مسیحیت ایسی اساس نہ بن سکتی تھی۔ انہوں نے یہ اساس وطن کے تصور میں تلاش کی۔ کیا انجام ہوا اور ہو رہا ہے۔ ان کے اساس کے انتخاب کا، لوتھر کی اصلاح، غیر مسلم اقلیت کا دور، اصولِ دین کا اسٹیٹ کے اصولوں سے افتراق بلکہ جنگ، یہ تمام قوتیں یورپ کو دھکیل کر کس کی طرف لے گئیں۔ لادینی، دہریت اور اقتصادی جنگوں کی طرف!

(مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں مضمون متعلقہ وطنیت)

———— (۴۷) ————

نبوتِ محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے۔ جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو۔ جو نبوتِ محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔ بالفاظِ دیگر یوں کہئے کہ بنی نوعِ انسان کی اقوام کو، باوجود شعوب و قبائل اور الوان و السنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے، ان تمام آلودگیوں سے منزہ کیا جائے جو زبان، مکان، وطن، قوم، نسل، نسب، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں اور اس طرح اس پیکرِ خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہم کنار رہتا ہے۔ یہ ہے مقامِ محمدی، یہ ہے نصب العین ملتِ اسلامیہ کا۔ اس کی بلندیوں تک پہنچنے میں معلوم نہیں حضرتِ انسان کو کتنی صدیاں لگیں، مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ اقوامِ عالم کی باہمی مغائرت دور کرنے اور باوجود شعوبی، قبائلی، نسلی، لونی اور لسانی امتیازات کے، ان کو ایک رنگ کر لینے میں جو کام اسلام نے تیرہ سو سال میں کیا ہے وہ دیگر ادیان سے تین ہزار سال میں بھی نہیں ہو سکا۔ بیقین جانئے کہ دینِ اسلام ایک پوشیدہ اور غیر محسوس حسیاتی اور نفسیاتی عمل ہے جو بغیر کسی تبلیغی کوششوں کے بھی عالمِ انسانی کے فکر و عمل کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایسے عمل کو حال کے سیاسی متکلمین کی جدت طرازیوں سے مسخ کرنا ظلمِ عظیم ہے بنی نوعِ انسان پر اور اس نبوت کی ہمہ گیری

ہر جس کے قلب و ضمیر سے اس کا آغاز ہوا۔ (مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں - مضمون متعلقہ وطنیت)

---

## (۵) عالم گیر پیغام کیلئے بھی ایک سوسائٹی کی ضرورت ہوتی ہے

مسٹر ڈکنسن نے آگے چل کر میرے فلسفہ کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے عالم گیر ہے لیکن باعتبار اطلاق، و انطباق مخصوص و محدود، ایک حیثیت سے ان کا ارشاد صحیح ہے۔ انسانیت کا نصب العین شعر اور فلسفہ میں عالمگیر حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اگر اسے مؤثر نصب العین بنانا اور عملی زندگی میں بروئے کار لانا چاہیں، تو آپ شاعروں اور فلسفیوں کو اپنا مخاطب اولین نہیں ٹھہرائیں گے اور ایسی ایک مخصوص سوسائٹی تک اپنا دائرۂ مخاطبت محدود کر دیں گے جو ایک مستقل عقیدہ اور معین راہِ عمل رکھتی ہو، لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی چلی جائے۔ میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے۔ (ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب - متعلقہ فلسفۂ سخت کوشی)

---

میری فارسی نظموں کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں بلکہ میری قوتِ قلب و جستجو ایک چیز پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشری نظام تلاش کیا جائے اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک معاشری نظام سے قطع نظر کر لیا جائے جس کا مقصدِ وحید، ذات پات، رتبہ و درجہ، رنگ و نسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے۔ اسلام دنیاوی معاملات کے باب میں نہایت ژرف نگاہ بھی ہے، اور پھر انسان میں بے نفسی اور دنیوی لذائذ و نعم کے آثار کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے۔ اور حسنِ معاملت کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے ہمسایوں کے بارے میں اسی قسم کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ یورپ اس گنج گراں مایہ سے محروم ہے اور یہ متاع اسے ہمارے ہی فیضِ صحبت سے حاصل ہو سکتی ہے۔ (ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب - متعلقہ سخت کوشی)

---

## (٦) مذہب نجی معاملہ نہیں

سوال یہ ہے کہ آج جو مسئلہ ہمارے پیش نظر ہے، اس کی صحیح حیثیت کیا ہے۔ کیا واقعی مذہب ایک نجی معاملہ نہیں؟ اور آپ یہ چاہتے ہیں کہ اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں، لیکن اس کے نظامِ سیاست کی بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ ہندوستان میں یہ سوال اور بھی اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ باعتبارِ آبادی ہم لوگ اقلیت میں ہیں۔ یہ دعویٰ کہ مذہبی واردات محض انفرادی اور ذاتی واردات ہیں، اہلِ مغرب کی زبان سے تو تعجب خیز نہیں معلوم ہوتا کیونکہ یورپ کے نزدیک مسیحیت کا تصور ہی یہی تھا کہ وہ ایک مشرب رہبانیت ہے جس نے دنیا سے مادیات سے منہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہ عالمِ روحانیت پر جما لی ہے۔ اس قسم کے عقیدے سے لہٰذا وہی نتیجہ مرتب ہو سکتا تھا جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے وارداتِ مذہب کی حیثیت ،

جیسا کہ قرآنِ پاک میں ان کا اظہار ہوا ہے، اس سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ محض حیاتی نوع کی واردات نہیں ہے کہ ان کا تعلق محض صاحبِ واردات کے اندرونِ ذات سے ہو، لیکن اس کے باہر اس کے گرد و پیش کی معاشرت پر ان کا کوئی اثر نہ پڑے۔ برعکس اس کے یہ وہ انفرادی واردات ہیں جن سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوتی ہے اور جن کے اولین نتیجہ سے ایک ایسے نظامِ سیادت کی تاسیس ہوئی جس کے اندر قانونی تصورات مضمر تھے اور جن کی اہمیت کو محض اس لئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی بنیاد وحی پر ہے۔ لہٰذا اس کا مذہبی نصب العین اس معاشرتی نظام سے جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے، الگ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کا ترک بھی لازم آئے گا۔

(خطبۂ صدارت مسلم لیگ سنہ ۱۹۳۰ء)

(۲)

یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں بلکہ یہ ایک ریاست ہے جس کا اظہار روسو سے بھی کہیں پیشتر ایک ایسے وجود میں ہوا جو عقدِ اجتماعی کا پابند ہو۔ ریاستِ اسلامی کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان شجر و حجر کی طرح کسی خاص زمین سے وابستہ نہیں بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتا ہے اور اس کے ایک زندہ جزو کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کا مالک ہے۔ (ایضاً)

## (۷) اسلام اپنے اصولوں میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا

اسلام ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں، بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلامی ہو، نامعقول و مردود ہے۔

(بجواب مولانا حسین احمد مدنی۔ متعلقہ قومیت)

(۲)

امتِ مسلمہ جس دین کی حامل ہے۔ اس کا نام دینِ قیم ہے۔ دینِ قیم کے الفاظ میں ایک عجیب و غریب لطیفۂ قرآنی مخفی ہے اور وہ یہ کہ صرف دین ہی مقوّم ہے۔ اس گروہ کے امورِ معاشی اور مادی کا جو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس کے نظام کے سپرد کر دے، بالفاظِ دیگر قرآن کی رو سے حقیقی، تمدنی یا سیاسی معنوں میں قوم، دینِ اسلام ہی سے تقویم پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن صاف صاف اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ کوئی دستور العمل جو غیرِ اسلام ہو نامعقول و مردود ہے۔ (ایضاً)

## (۸) ملائیّت، تصوّف، ملوکیّت

(۱) ملائیت:۔ علماء اسلام کے لئے ایک قوتِ عظیم کا سرچشمہ رہے ہیں، لیکن صدیوں کے جمود نے بعد خاص کر

زوالِ بغداد کے زمانہ سے وہ بے حد قدامت پرست بن گئے۔ اور آزادیٔ اجتہاد (یعنی قانونی امور میں آزادانہ رائے قائم کرنا) کی مخالفت کرنے لگے۔ وہابی تحریک جو انیسویں صدی کے مصلحین کے لئے حوصلہ افزا تھی، درحقیقت ایک بغاوت تھی، علماء کے اسی جمود کے خلاف۔ پس انیسویں صدی کے مصلحینِ اسلام کا پہلا مقصد یہ تھا کہ عقائد کی جدید تفسیر کی بجائے اپنے بڑھتے ہوئے تجربہ کی روشنی میں قانون کی جدید تعبیر کرنے کی آزادی حاصل کی جائے۔

(۲) تصوف: مسلمانوں پر ایک ایسا تصوف مسلط تھا جس نے حقائق کی آنکھیں بند کر لی تھیں، جس نے عوام کی قوتِ عمل کو ضعیف کر دیا تھا اور ان کو ہر قسم کے توہم میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اور عوام کی جہالت اور ضعفِ اعتقادی سے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ بن گیا تھا۔ اس نے بتدریج اور غیر محسوس طریقہ پر مسلمانوں کی قوتِ ارادی کو کمزور اور اس قدر نرم کر دیا تھا کہ مسلمان اسلامی قانون کی سختی سے بچنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ انیسویں صدی کے مصلحین نے اس قسم کے تصوف کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ اور مسلمانوں کو عصرِ جدید کی روشنی کی طرف دعوت دی۔ یہ نہیں کہ یہ مصلحین مادہ پرست تھے؛ ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اسلام کی روح سے آشنا ہو جائیں، جو مادہ سے گریز کرنے کی بجائے اس کی تسخیر کی کوشش کرتی ہے۔

(۳) ملوکیت: مسلمان سلاطین کی نظر اپنے خاندان کے مفاد پر جمی رہتی تھی اور اپنے اس مفاد کی حفاظت کے لئے اپنے ملک کو بیچنے میں پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ سید جمال الدین افغانی کا مقصدِ خاص یہ تھا کہ مسلمانوں کو دنیائے اسلام کے ان حالات کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا جائے۔

(ختمِ نبوت — بجواب پنڈت جواہر لال نہرو)

## (۹) پاکستان کی آزادی مسلمانوں کے جمود کو توڑ ڈالے گی

میں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازنِ قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائے گا اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔ (خطبۂ صدارت - سنہ ۱۹۳۰ء)

## (۱۰) کمیونزم خلافِ اسلام ہے

"سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیات کے مذہب کے مخالف ہیں اور اس کو افیون تصور کرتے ہیں ---- لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔

میرے نزدیک تاریخِ انسانی کی بادی تاریخ سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا، جس کی تشریح میں نے ان تحریروں میں جا بجا کی ہے اور سب سے بڑھ کر اس فارسی مثنوی میں جو عنقریب آپ کو ملے گی۔ جو روحانیت میرے نزدیک مغضوب ہے یعنی افیونی خواص رکھتی ہے، اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے۔

(مکتوب بنام غلام السیدین۔ محررہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

## (۱۱) یہی اسلام کی منزہ شکل ہے

لیگ کو آخر الامر یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ ایک ایسی جماعت رہنا چاہتی ہے جو صرف مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی کرے یا وہ عوام کی نمائندگی کرنا چاہتی ہے۔ اس وقت تک عوام نے لیگ میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور اس کی ان کے پاس وجوہات ہیں۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ کوئی سیاسی جماعت جو مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی مرفع الحالی کا وعدہ نہیں دے سکتی، عوام کے لئے کبھی جاذبِ نگاہ نہیں بن سکے گی۔ (اس وقت حالت یہ ہے کہ) آئینِ جدید (یعنی ۱۹۳۵ء کے آئین) کے مطابق اعلیٰ ملازمتیں امراء کے بیٹوں کے حصے میں آجائیں گی اور نچلی ملازمتیں وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے وقف ہو جائیں گی (عوام اور متوسط درجہ کے مسلمانوں کا ان میں کوئی حصہ نہیں ہوگا)۔ یہ تو رہیں ملازمتوں کی بابت۔ اسی طرح دیگر معاملات میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے کبھی عوام کی مرفع الحالی کے متعلق کچھ نہیں سوچا۔ روٹی کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہا ہے کہ وہ گزشتہ دو سو سال سے نیچے ہی نیچے جا رہا ہے۔ اس لئے سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا علاج کیا ہے؟ لیگ کا مستقبل اسی سوال کے حل پر موقوف ہے۔ اگر لیگ نے اس باب میں یہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے اسی طرح بے تعلق رہیں گے جس طرح اس وقت تک بے تعلق رہے ہیں۔ یہ ہماری خوش فہمی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشو و نما دی جا سکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سے سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ پرورش ضرور مل جاتا ہے۔

(مکتوب بنام قائدِ اعظم محمد علی جناح۔ مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء)

# دُرِ منثور

ان موتیوں میں سے چند ایک جو اقبالؒ کے مکتوبات و دیگر تحریراتِ نثر میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔

## (۱) داخلی انقلاب

زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب

نہ ہو۔ اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ (دیباچہ پیامِ مشرق)

## (۲) نسل پرستی

تاریخ انسانیت میں اسلام کا ظہور ایسے وقت میں ہوا جب وحدتِ انسانیت کے لئے دقیانوسی اصول، مثلاً خونی رشتے اور تخت و تاج کے علائق ناکام ہو رہے تھے۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک وحدتِ انسانیت کا اصول گوشت پوست سے متعلق نہیں، بلکہ اس کا سرچشمہ انسانی قلب میں ہے۔ انسانیت کے نام اسلام کا عمرانی پیغام یہی ہے کہ نسلی امتیازات مٹا دو، ورنہ خانہ جنگی میں تباہ ہو جاؤ گے۔ یہ کہنا مبالغہ آمیزی نہ ہوگا کہ اسلام فطرت کے نسل ساز مظاہر کو پسند نہیں کرتا اور اپنے مخصوص اداروں سے ایسے نقطۂ نگاہ کی تخلیق کرتا ہے جو فطرت کے نسل ساز قویٰ کو بیکار کر دے۔ انسانوں کے سدھارنے کے لئے اسلام نے ایک ہزار سال میں وہ کچھ کر دکھایا جو عیسائیت اور بدھ مت سے دو ہزار سال سے اوپر میں بھی نہیں ہو سکا۔

(احمدیت سے متعلق۔ نہرو کے جواب میں)

## (۳) قومیت

اسلام کا مذہبی نصب العین اس معاشرتی نظام سے ناقابلِ شکست طریق سے وابستہ ہے، جسے اس نے تشکیل کیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک کا انکار دوسرے کے انکار کو مستلزم ہے۔ لہٰذا قومی خطوط پر کسی ہیئتِ اجتماعیہ کا قیام اسلامی اصولِ وحدت کا نقیض ہے۔ کوئی مسلمان اس کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ (خطبۂ صدارت سنہ ۱۹۳۰ء)

## (۴) مذہب اور سیاست

اسلام، محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالمِ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے، جو اس کے قومی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ قدیم زمانے میں دین قومی تھا جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا۔ بعد میں نسلی قرار پایا جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی۔ نہ انفرادی ہے نہ پرائیویٹ۔ بلکہ خالصتہً انسانی ہے۔ اور اس کا مقصد، باوجود تمام فطری امتیازات کے، عالمِ بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے عالمِ انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے، جو ایک اُمت کی تشکیل اور اس کی بقا کے لئے ضروری ہے۔

(مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں بیان)

## (۵) شریعت کا مقصود

اسلام نفسِ انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا، بلکہ ان کے عمل کے لئے حدود متعیّن کرتا ہے ان حدود کے معین کرنے کا نام اصطلاحِ اسلام میں شریعت یا قانونِ الٰہی ہے

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ ۱۹۳۶ء)

## (۶) دورِ انحطاط کے پیشوا

اقوام و ملل کے عروج و زوال کی داستانوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قوموں کی زندگی کی سوتیں خشک ہونا شروع ہوتی ہیں تو ان کا زوال بجائے محدود ان کے شعراء فلاسفہ سیاسیین وغیرہم کو ایک نئی تحریکِ خیال سے ابھارتا ہے۔ چنانچہ وہ پیغمبرانہ شان سے اُٹھتے ہیں اور استدلال کے گورکھ دھندے تیار کرکے حیاتِ ملّی کے رذائل و لوائم کے گیت گاتے اور انہیں خوش آئند و درخشاں بناتے ہیں۔ یہ پیغمبر غیر شعوری طور پر قنوطیت کو رہبانیت کے نگاہ فریب لباس میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اہلِ قوم کے عملی قویٰ کو شَل، اور اُن کی روحانی قوتِ نمو کو یکسر فنا کر دیتے ہیں۔ (بیان متعلقہ احمدیت)

## (۷) مجوسی کلچر

جب کسی کلچر میں علاماتِ زوال نمودار ہونا شروع ہو جاتی ہیں تو اس کی فلسفیانہ بحثیں، اس کے تصورات اور اس کے وارداتِ روحانی کی شکلیں جامد اور غیر متحرک ہو جاتی ہیں۔ مجوسی کلچر ایسے ہی دور سے گذر رہی تھی کہ اسلام کا ظہور ہوا۔ جہاں تک میں تاریخِ کلچر کا مطالعہ کر سکا ہوں، اسلام نے مجوسی کلچر کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ قرآن میں بیّن ثبوت اس امر کے ملتے ہیں کہ قرآن کا مقصد یہ تھا کہ وہ نہ صرف فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دے بلکہ واردات و کیفیاتِ روحانی کی تشکیلِ نو کرے۔ لیکن ہمارے مجوسی ورثہ نے اسلام کی زندگی کی سوتیں خشک کر دیں اور اس کی روح کی نشو و نما اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے سلسلے کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

(احمدیت سے متعلق۔ اخبار لائٹ کے جواب میں)

## (۸) محاورۂ عرب

ہندی مسلمانوں کی بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس ملک سے عربی زبان کا علم اٹھ گیا ہے اور قرآن کی تفسیر میں محاورۂ عرب سے بالکل کام نہیں لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں قناعت اور توکل کے وہ معانی لئے جاتے ہیں جو عربی زبان میں ہرگز نہیں۔

(سراج الدین پال کے نام خط۔ ۱۹۱۶ء)

## (۹) ملّت کی حالت

اسلام کے لئے اس ملک میں نازک زمانہ آ رہا ہے۔ جن لوگوں کو کچھ احساس ہے ان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش اس ملک میں کریں۔ عناد میں مداہنت آ گئی ہے۔ یہ گروہ حق کو کہنے سے ڈرتا ہے۔ صنوفیاء اسلام سے بے پرواہ اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آجکل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفعت و عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں۔ عوام میں جذبہ موجود ہے مگر ان کا کوئی بے غرض رہنما نہیں۔ (چودھری نیاز علی خاں کے نام خط۔ ۱۹۳۷ء)

## (۱۰) اضطراب

میرے دل میں ممالکِ اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار نہ کر لے۔
(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۲۶ء)

## (۱۱) فکر سے محرومی

قومیں فکر سے محروم ہو کر تباہ ہو جاتی ہیں۔ (خطبۂ صدارت۔ ۱۹۳۲ء)

## (۱۲) لیڈروں کا فقدان

اس وقت (ہندوستان کے) مسلمان دو امراض میں مبتلا ہیں۔ پہلا مرض اُن قائدین کا فقدان ہے، جو اسلام کی روح اور تقریر کو بھی بخوبی سمجھتے ہوں، اور تاریخِ جدید کے میلانات پر بھی ان کی نگاہ ہو۔ ایسے اشخاص ہی قوموں کی قوتِ متحرکہ ہوتے ہیں۔ لیکن وہ خدا کی دین ہوتے ہیں اور ضرورت کے مطابق پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ دوسرا مرض احساسِ اجتماعیت کا فقدان ہے۔ اس سے افراد اور گروہ اپنی جداگانہ راہیں تلاش کر رہے ہیں اور عمومی فکر اور اجتماعی حرکت میں کوئی اضافہ نہیں کر رہے۔ اس وقت ہم سیاست میں وہ کچھ کر رہے ہیں جو مذہب میں صدیوں سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ مذہبی تفرقہ بازی قومی وحدت کو زیادہ نقصان نہیں پہنچاتی، کیونکہ مذہبی فرقے اس حد تک باغی نہیں ہو جاتے کہ اسلام سے ہی منحرف ہو جائیں، لیکن سیاسی انتشار بالخصوص ایسے نازک وقت میں کہ ملت کا اجتماعی مفاد اتحادِ عمل کا متقاضی ہو، مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء)

## (۱۳) احترامِ آدمیّت

انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔ (ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

## (۱۴) وحدتِ انسانیت

قومی وحدت ہرگز قائم و دائم نہیں ہے۔ وحدت صرف ایک معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے جو نسل، زبان، رنگ اور قومیت سے بالاتر ہے۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء)

## (۱۵) قومیت سے بلند

اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالکِ مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قومی انسانی سیرت کی تجدید و تخلیق ہو، قابلِ احترام ہے۔
(دیباچہ پیامِ مشرق)

## (۱۶) وطنیت

میں یورپی تصورِ وطنیت کا مخالف ہوں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس سے مسلمانوں کو کم تر مادی فوائد حاصل ہوں گے بلکہ اس لئے کہ اس میں منکرِ خدا مادیت کے جراثیم پائے جاتے ہیں جسے میں جدید انسانیت کیلئے عظیم ترین خطرہ سمجھتا ہوں (خطبۂ صدارت ۱۹۳۲ء)

## (۱۷) مغربی سیاست

جن نام نہاد مدبّرین کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سونپی گئی تھی، وہ خونریزی، سفاکی، استیلا اور ظلم کے دیوتا ثابت ہوئے۔ جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاق انسانی کے نوامیسِ عالیہ کی حفاظت کریں، انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں اور انسانیت کی ذہنی اور عملی سطح کو بلند کریں، انہوں نے ملوکیت و استعمار کے جوش میں لاکھوں کروڑوں مظلوم بندگانِ خدا کو ہلاک و پائمال کر ڈالا۔ صرف اس لئے کہ ان کے اپنے مخصوص ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان مہیا ہو جائے۔ (ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

## (۱۸) تاریک ترین دور

اس زمانہ میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت اور خدا جانے اور کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ اور ان نقابوں کے نیچے دنیا بھر کے تمام گوشوں میں قدرِ حریت اور شرفِ انسانیت کی وہ مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخِ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔
(ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

## (۱۹) قوانینِ الٰہیہ کی اتباع

جب تک اقوام کی خودی قانونِ الٰہی کی پابند نہ ہو، امنِ عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ سنہ ۱۹۳۶ء)

---

## (۲۰) انحطاط کا جادو

انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے صید پر ایسا اثر ڈالتا ہے جس سے انحطاط کا مسحور اپنے قاتل کو اپنا مربّی تصوّر کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے۔

(سراج الدین پال کے نام خط۔ سنہ ۱۹۱۶ء)

---

## (۲۱) ایرانی اثرات

ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام (یعنی خدا کے عطا کردہ دین) سے اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں۔ جس کی اشاعت رسول اللہ صلعم سے ہوئی۔

(منشی سراج الدین کے نام خط۔ سنہ ۱۹۱۵ء)

---

## (۲۲) تصوّف

تصوّف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹیکل انحطاط کے زمانہ میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا جس قوم میں توانائی مفقود ہو جائے، جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی تو قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترکِ دنیا موجبِ تسکین۔ اس ترکِ دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی و کاہلی اور اس شکست کو جو ان کو تنازع للبقا میں ہو، چھپایا کرتی ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔

(سراج الدین پال کے نام خط۔ سنہ ۱۹۱۶ء)

---

**(۲۳)** تصوف کا وجود سرزمینِ اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ سنہ ۱۹۱۷ء)

---

**(۲۴)** جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظامِ عالم کے حقائق، اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے، تو میری روح اس

کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔ (علامہ اسلم جیراجپوری کے نام خط۔ ۱۹۱۹ء)

---

(۲۵) ہندی اور ایرانی صوفیا میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر فلسفہ وحدانیت (وحدت الوجود) اور بدھ مت کے زیر اثر کی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہے۔ میرے عقیدے کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اسی تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہے۔ (مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ ۱۹۳۶ء)

---

(۲۶) حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دیتا ہے۔ یہ ایک نہایت (SUBTLE) طریق تنسیخ کا ہے۔ اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعرا ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث (وحدت) وجودی فلسفہ کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلانِ طبع موجود تھا۔ اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کا نشوونما نہ ہونے دیا، تاہم وقت پا کر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح ظاہر ہوا۔ یا بالفاظِ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ ان شعراء نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائرِ اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے اور اسلام کی ہر محمود شے کو مذموم بیان کیا ہے۔

(سراج الدین پال کے نام خط۔ ۱۹۱۶ء)

---

## (۲۷) ابنِ عربی

تصوف کا سب سے پہلا شاعر عراقی ہے جس نے لمعات میں فصوص الحکم محی الدین ابنِ عربی کی تعلیموں کو نظم کیا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے، فصوص میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں۔

(سراج الدین پال کے نام خط۔ ۱۹۱۶ء)

---

## (۲۸) خوئے غلامی

جب انسان میں خوئے غلامی راسخ ہو جاتی ہے تو وہ ہر ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتا ہے جس کا مقصد قوتِ نفس اور روحِ انسانی کا ترفع ہو۔ (مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ ۱۹۳۶ء)

---

## (۲۹) قرآن کا مسلک

اگر یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال دیا ہے تاہم مسلک میرا وہی ہے جو قرآن کا ہے۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۳۲ء)

## (۳۰) شاعری

میرے زیرِ نظر حقائقِ اخلاقی و ملّی ہیں۔ زبان میرے لئے ثانوی حیثیت رکھتی ہے، بلکہ فنِ شعر سے بھی بحیثیت فن کے نابلد ہوں۔
(پروفیسر شجاع کے نام خط۔ ۱۹۳۱ء)

---

(۳۱) شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کبھی میرا مطمحِ نظر نہیں رہا۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدِ نظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔
(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۱۹ء)

---

(۳۲) میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے میرا کوئی رقیب نہیں۔ اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فنِ شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصدِ خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے ورنہ ؎

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست　　　کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۲۷ء)

## (۴)

ادارۂ طلوعِ اسلام یومِ اقبالؒ کی تقریب پر ہر سال ایک خصوصی اجتماع کا اہتمام کیا کرتا ہے۔ امسال بھی ایسا ہی ارادہ تھا اور اس کیلئے پرویز صاحب نے اپنا خصوصی خطاب بھی مرتب کر لیا تھا لیکن ملک میں اس وقت جذبات کا جو تلاطم برپا ہے اس نے اس قسم کی تقاریب کیلئے فضا سازگار نہیں۔ بنا بریں ہمارے ہاں وہ تقریب تو نہیں منائی گئی البتہ پرویز صاحب کا خطاب اشاعتِ ہٰذا میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اسلامی مملکت میں بنیادی سوال یہ پیش ہوتا ہے کہ ایسا ضابطۂ قوانین کس طرح مرتب کیا جائے جو ملک کے تمام مسلم باشندوں (بالفاظِ دیگر تمام فرقوں) کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کیا جائے۔ دعویٰ یہ کیا گیا کہ ایسا ضابطۂ قوانین "کتاب و سنت" کی بنیادوں پر مدون کیا جا سکتا ہے لیکن مودودی صاحب نے آج سے سات سال پہلے (۱۹۶۹ء میں) اعلان کر دیا کہ کتاب و سنت کی بنیاد پر ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے ہمارے علماء میں سے کسی نے بھی اُن کے اعلان کی تردید نہیں کی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان حضرات کا فریضہ تھا کہ یا تو وہ مودودی صاحب کے اس اعلان کی تردید کرتے اور یا یہ بتاتے کہ ایسا ضابطۂ قوانین کس بنیاد پر مرتب کیا جا سکے گا۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ علامہ اقبالؒ نے اسلامی مملکت کا تصور پیش کرنے کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا تھا کہ اس میں قانون سازی کا اصول کیا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ قرآن مجید کو بنیاد قرار دے کر احادیث اور فقہ کے موجودہ مجموعوں سے استفادہ کیا جائے اور اس طرح ایک ایسا جدید ضابطۂ قوانین مرتب کیا جائے جو موجودہ زمانے کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔ پیشِ نظر خطاب میں اسی اجمال کی تفصیل سامنے لائی گئی ہے۔ واضح رہے کہ پرویز صاحب (یا طلوعِ اسلام) نہ تو حدیث کے منکر ہیں نہ سنت کے۔ وہ مودودی صاحب سے متفق ہیں کہ کتاب و سنت کی بنیاد پر ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ اور اس کے بعد وہ سمجھتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ کا پیش کردہ اصول ممکن العمل بھی ہے اور اسلام کی منشا کے مطابق بھی۔ ہمیں امید ہے کہ ملک کا سنجیدہ طبقہ پرویز صاحب کے خطاب کا اسی سکون اور غور و فکر کے ساتھ مطالعہ کریگا جس کی اس سوال کی اہمیت متقاضی ہے۔

باسمہ تعالیٰ

# اسلامی مملکت کا تصور ——— اقبالؒ کے نزدیک

بتقریب یومِ اقبالؒ - اپریل ۱۹۷۷ء

پرویز

ادارۂ طلوعِ اسلام - گلبرگ لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

# اسلامی مملکت کا تصوّر

بیا ساقی بگرداں ساتگیں را  بیفشاں بر دوگیتی آستیں را
حقیقت را بہ رندے فاش کردند  کہ ملّا کم شناسد رمزِ دیں را

دین کی تاریخ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم، بصیرت افروز حقیقت بیان کی ہے جب کہا کہ:-

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۲۲/۵۲)

"اے رسولؐ! تجھ سے پیشتر کوئی صاحبِ وحی ایسا نہیں ہوا جس کے ساتھ یہ ماجرا نہ گزرا ہو کہ (اس کی وفات کے بعد) دین کے مخالفین نے اس کی وحی میں آمیزش نہ کر دی ہو اس کے بعد خدا ایک اور نبی بھیج دیتا اور اس کی طرف وحی کے ذریعے اس آمیزش کو زائل کر کے اپنے قوانین کو پھر سے محکم کر دیتا۔ اللہ سب کچھ جاننے والا صاحبِ حکمت ہے۔" رسول۔۔۔ کی وحی میں آمیزش کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ خدا کا دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ دین نام تھا احکام و اقدارِ خداوندی کو معاشرہ میں قانونی حیثیت سے نافذ کرنے کا۔ اس کے برعکس، مذہب، خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق تھا جو بندگی، پرستش یا مختلف رسوم کی رو سے انفرادی طور قائم ہو جاتا تھا۔ دنیا میں جتنے مذاہب پائے جاتے ہیں ان کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ ابتداء میں دین ہی تھے۔ (قرآن کریم میں ہے کہ خدا نے ہر قوم میں رسول بھیجے تھے۔) مفاد پرست گروہوں نے جن کے سرکردہ مذہبی پیشوا تھے، انہیں مذہب میں تبدیل کر دیا۔ ان مذہبی پیشواؤں کی کیفیت یہ تھی کہ:-

يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۤ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ ھٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَـمَنًا قَلِيْلًا ۔۔۔ (۲/۷۹)

یہ خود شریعت وضع کرتے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ یہ شریعتِ خداوندی ہے۔ اور ایسا کچھ پیسے کمانے کے لئے کرتے تھے۔ مذہب ان کا پیشہ بن جاتا تھا۔

خدا نے رسول اللہ کی طرف جو دین بھیجا اس کے متعلق کہہ دیا کہ:-

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ... (۶/۱۱۵)

خدا نے اس وحی کی رو سے اپنے قوانین کو عدل و صداقت کی بنیادوں پر مکمل کر دیا ہے۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکے گا۔ اس لئے کہ:-

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵/۹)

ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم خود اس کی حفاظت کریں گے۔

ظاہر ہے کہ اس کے بعد وحی کی ضرورت نہ تھی، اس لئے یہ ختمِ نبوت کا اعلان تھا۔ کلام اللہ کے مکمل، غیر متبدل اور محفوظ ہو جانے کے معنی یہ تھے کہ انسانوں کے ساتھ خدا کے مزید کلام کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اب خدا کے بندوں کے ساتھ کلام کرنے کا ذریعہ اس کا یہی کلام (قرآن مجید) ہوگا۔

لیکن جو کچھ دین کے ساتھ اس سے پہلے ہوتا رہا وہی کچھ اس دین کے ساتھ بھی ہوا جو قرآن میں دیا گیا تھا۔ آپ حیران ہوں گے کہ یہ کیسے ہو گیا؟ کیا قرآن محفوظ نہ رہا؟ کیا اس میں بھی آمیزش ہو گئی؟ اگر ایسا ہو گیا تو خدا کی اس ذمہ داری کے متعلق کیا کہا جائے گا جو اس نے اسے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے اوپر لی تھی؟ نہیں! ایسا نہیں ہوا۔ قرآن کا متن تو بالکل محفوظ رہا۔ اس میں نہ ذرا سا تغیر و تبدل ہوا، نہ کسی قسم کی آمیزش! ——— لیکن ہوا ——— یہ کہ خارج از قرآن متعدد عناصر کو

## اسلام مذہب بن گیا

وحی کا درجہ دے دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن تو محض تلاوت کے لئے رہ گیا اور خارج از قرآن عناصر نے اس کی جگہ لے لی اور اس طرح دین مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ اب جو کچھ اسلام کے نام سے دنیا میں متعارف ہے وہ دین نہیں بلکہ یہی مذہب ہے۔ دین کے مذہب میں تبدیل ہو جانے کی سب سے پہلی محسوس علامت یہ ہوتی ہے کہ امت میں وحدت نہیں رہتی۔ وہ فرقوں میں بٹ جاتی ہے، اور ہر فرقہ کی شریعت کی آخری سند (خدا کے بجائے) کوئی نہ کوئی شخصیت قرار پا جاتی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم میں فرقہ بندی کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ (۳۰/۳۱)

(جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے) جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا تھا تو خدا ایک اور نبی بھیج دیتا تھا جو وحی کو انسانی آمیزشوں سے پاک اور صاف کر دیتا تھا۔ لیکن ختمِ نبوت کے بعد، نبیوں کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اسے جاری رکھنے کی ضرورت اس لئے بھی نہیں تھی کہ رسول اللہؐ کے بعد، خدا کی وحی (قرآن مجید) میں آمیزش نہیں ہو سکتی تھی جسے الگ کرنے کے لئے نبی کی ضرورت لاحق ہوتی تھی۔ خدا کی آیات (قرآنی قوانین) اپنی منزہ شکل میں موجود تھیں۔ ضرورت صرف اس امر کی تھی کہ ان آیات کو (قرآنی الفاظ میں) "محکم" کیا جائے۔ (ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ آيَاتِهٖ) آیاتِ قرآنی کو محکم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انہیں دین کی اساس قرار دیا جائے۔ انہیں حق و باطل۔ جائز و ناجائز۔ صحیح اور غلط کا معیار تسلیم کیا جائے۔ لیکن یہ فریضہ انفرادی طور پر سرانجام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ یہ امت کا اجتماعی

فریضہ تھا۔ جس کے لئے ضروری تھا کہ ایک ایسی مملکت قائم کی جائے جس کا جملہ کاروبار، قرآن مجید کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے کتبِ سماوی کے نزول کا مقصد یہی تھا۔ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ (۲/۲۱۳) کہ لوگوں کے اختلافی امور میں ان کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ رسول اللہؐ سے بھی یہی کہا گیا تھا کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ (۵/۴۸) تم لوگوں میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو۔ اس اُمت سے بھی واضح الفاظ میں کہ دیا گیا تھا کہ:۔

## استحکام آیات اللہ کا عملی طریق

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (۴۲/۱۰)

اگر کسی معاملہ میں تم میں اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ خدا کی کتاب کی رو سے کر لیا کرو۔

حتیٰ کہ حتمی طور پر یہ اعلان کر دیا کہ:۔

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۵/۴۴)

جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

لہٰذا، آیات اللہ کو محکم کرنے کے لئے خدا کی طرف سے کسی کے آنے کی ضرورت نہیں تھی (خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے)۔ اس فریضہ کو اُمت نے خود سرانجام دینا تھا۔ یعنی خارج از قرآن عناصر کو شریعتِ خداوندی قرار دینے کے بجائے، کتاب اللہ کو مملکت کا ضابطۂ نظام قرار دینا اُمت کا فریضہ تھا۔ اس کے لئے کسی مامور من اللہ کی ضرورت نہیں تھی۔ خدا کی طرف سے جس نے آنا تھا وہ آخری مرتبہ آکر اور خدا کی مکمل و محفوظ کتاب دے کر چلا گیا تھا۔ (علیہ التحیۃ والسلام)

---

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، اسلام، صدیوں سے دین کے بجائے مذہب بن چکا ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ اُمت کو بتایا جائے کہ جس مذہب کی تم پیروی کر رہے ہو، وہ دینِ خداوندی نہیں۔ اسلام اسی صورت میں الدین کی شکل اختیار کر سکے گا جب اپنی ایک آزاد مملکت ہو اور اس میں قرآن کی حکمرانی ہو۔ ہمارا زمانہ اس اعتبار سے انتہائی خوش بخت ہے کہ اس میں ایک ایسا دیدہ ور پیدا ہوا جس نے اس فراموش کردہ عظیم حقیقت کو اُمت کے سامنے پیش کیا۔ یہ تھے حکیم الامت، علامہ اقبالؒ جن کی یاد منانے کے لئے ہم آج یہاں جمع ہوئے ہیں۔ اقبالؒ نے اس قسم کا کوئی دعوےٰ نہیں کیا کہ وہ مامور من اللہ ہیں، یا انہیں خدا کی طرف سے الہام ہوتا ہے۔ ایسا دعویٰ ختم نبوت کے منافی اور یکسر باطل تھا۔ انہوں نے واضح الفاظ میں بتایا کہ قرآن کریم پر غور و تدبر اور اسوۂ رسول اللہؐ کے گہرے مطالعہ سے انہوں نے اس حقیقت کو سمجھا ہے جسے وہ اپنی بصیرت کے مطابق قوم کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ آپ ان کے کلام کو شروع سے اخیر تک دیکھ جائیے اس میں روش روش پر آپ کو عظمتِ قرآنی کے پھول کھلے دکھائی دیں گے۔ ان کا پیغام، قرآنی حقائق ہی کی تشریح و توضیح ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ جب سابقہ انبیاء کرامؑ دین کو اس کی حقیقی شکل میں پیش

کرتے تھے تو مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوتی تھی۔ علامہ اقبالؒ نے دینی مملکت کا تصور پیش کیا اور قائدِاعظمؒ نے اس تصور کی عملی تشکیل کے لئے تحریکِ پاکستان کا آغاز کیا۔ نیشنلسٹ علماء کی طرف سے اس تحریک کی مخالفت لازمی تھی کیونکہ ان کے پیشِ نظر تو اسلام کا وہی تصور تھا جس میں اعتقادات، عبادات، اور شخصی قوانین کی آزادی ہو اور پبلک لاز، مغرب کے جمہوری انداز سے وضع کئے جائیں۔ ان کا اسلام کے متعلق یہی تصور تھا جس پر جامع انداز میں تنقید کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ :-

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ۔۔۔ ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اسلام تو اسی صورت میں آزاد ہو سکتا ہے کہ جملہ قوانینِ مملکت، کتاب اللہ کی حدود کے اندر رہتے ہوئے متعین کئے جائیں۔ اور یہ، اپنی آزاد مملکت کے بغیر ممکن نہیں۔ اسلامی نظام کا یہ تصور، اُمت کی نگاہوں سے صدیوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اسی حقیقت کو واضح کرنے کیلئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ :-

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است ۔۔۔ رسم و آئینِ مسلماں دیگر است

قرآن کا نصب العین۔ اس کی منزل۔ اس کا منتہیٰ۔ اس کا مقصود کچھ اور ہے اور مسلمانوں کا اسلام کا تصور، ان کے رسوم و مناسک، ان کا شعارِ زندگی، ان کا آئینِ حیات کچھ اور۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں :-

بندۂ مومن ز قرآں بر نخورد ۔۔۔ در ایاغِ او نہ مے دیدم نہ دُرد

اصل یہ ہے کہ امتِ مسلمہ نے قرآنِ کریم کے نخلِ حیات کا پھل کھایا ہی نہیں۔ یہ وجہ ہے کہ اس کے ساغرِ زندگی میں، قرآن کی شرابِ طہور تو ایک طرف، اس کا تہ جرعہ تک بھی دکھائی نہیں دیتا۔ کیا یہ حقیقت انتہائی تعجب انگیز اور حیرت افزا نہیں کہ :-

خود طلسمِ قیصری و کسریٰ شکست ۔۔۔ خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

وہ قوم جس نے قیصر و کسریٰ کی ملوکیت کو نیست و نابود کر دیا، اس کے بعد، وہ خود تختِ ملوکیت بچھا کر اس پر مسند نشین ہو گئی۔ اور پھر :-

تا نہالِ سلطنت قوت گرفت ۔۔۔ دینِ او نقشِ از ملوکیت گرفت

جب نظامِ ملوکیت محکم ہو گیا تو دین، تمام تر اسی کے رنگ میں رنگا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ـــــ آفریدی شرع و آئینے دگر ـــــ اسلام کی جگہ ایک مذہب، ایک نئی شریعت وجود میں آ گئے۔ اب اس کا علاج یہ ہے کہ ـــــ اندکے با نورِ قرآں در نگر۔

یہی تھا وہ "نورِ قرآن" جس کی روشنی میں علامہ اقبالؒ نے اسلامی مملکت کے بنیادی تصورات نہایت واضح الفاظ میں پیش کئے۔ آج کی نشست میں، میں اس کے مختصر سے خط و خال آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ اس ضمن میں، ان کے سات لیکچروں کے مجموعہ میں سے چھٹا خطبہ، اور ۱۹۳۰ء کے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد کا خطبۂ صدارت، خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں، میری یہ

تصریحات بیشتر انہی کے اقتباسات پر مشتمل ہیں۔

---

## الٰہ آباد کا خطبۂ صدارت

آپ نے ۱۹۳۰ء کے خطبۂ صدارت کا آغاز ان الفاظ سے کیا۔

آپ حضرات نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لئے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہے، اور اپنے اس عقیدہ میں مایوسی کا کوئی شائبہ نہیں پاتا کہ اسلام ایک زندہ اور پائندہ قوت ہے جو انسانی نگاہ کو جغرافیائی حدود و قیود کے قفس سے آزاد کر کے اسے اس کی فطری وسعتوں میں اڑنے بال کشائی دے گا۔ جس کا عقیدہ یہ ہے کہ دین، انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک اہم ترین قوت کا حامل ہے اور جسے اس کا محکم یقین ہے کہ اسلام خود تقدیرِ الٰہی ہے۔ زمانہ کی تقدیریں اس کے ہاتھ میں رہیں گی، اور اس کی تقدیر کسی کے ہاتھ میں نہیں ہوگی۔ ایسا شخص مجبور ہے کہ تمام مسائل کو اپنے خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھے۔ یہ ہرگز نہ خیال فرمائیے کہ جس مسئلہ کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ کوئی نظری مسئلہ ہے۔ نہیں یہ تو ایک زندہ اور عملی مسئلہ ہے جو خود نفسِ اسلام پر بحیثیت ایک نظامِ حیات و عمل کے اثر انداز ہوگا۔ اس مسئلہ کے صحیح اور مناسب حل پر ہی اس امر کا انحصار ہے کہ آپ حضرات ہندوستان میں ایک ممتاز تہذیب کے علمبرداروں کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں گے۔

اس تمہید کے بعد انہوں نے، مذہب اور دین کے فرق کو ان الفاظ میں نمایاں کیا۔ فرمایا:۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام، خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی واسطہ کا نام نہیں۔ یہ ایک نظامِ حکومت ہے جس کی ہیئتِ ترکیبی میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ وہ ہر عملِ خیر کو اپنے اندر مہذب کر لے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی روسو کے دماغ میں ایسے نظام کا خیال تک بھی نہیں آیا تھا۔ اس نظام کی بنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے جس کی رو سے انسان جمادات اور نباتات کی طرح پابگلِ مخلوق نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو کبھی اِس خطۂ زمین سے منسوب کر دیا اور کبھی اُس سے۔ بلکہ وہ ایک ایسی روحانی ہستی سمجھا جاتا ہے جس کی صحیح قدر و قیمت اُس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک خاص معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فٹ ہو۔ وہ ایک فعّال مشینری کا پرزہ ہوتا ہے اور اسے ٹھیک انداز میں چلانے کے لئے اس پر حقوق و فرائض کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

اس نظری بحث کے بعد وہ اُس عملی سوال کی طرف آئے جس کے لئے یہ تمہید اٹھائی گئی تھی۔ اس ضمن میں انہوں نے کہا:۔

ہندوستان دنیا بھر میں بہت بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بہ حیثیت ایک تمدنی

قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ مسلمانانِ ہند کے اس زندہ اور جاندار طبقہ میں، کہ جس کے بل بوتے پر یہاں برطانیہ کی حکومت قائم ہے، (باوجودیکہ برطانیہ نے ان سے کبھی منصفانہ برتاؤ نہیں کیا) اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو یہ آخرالامر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھا دے گا۔

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا:۔

تنہا ایک ملک میں سات کروڑ[1] فرزندانِ توحید کی جماعت کوئی معمولی چیز نہیں۔ تمام مسلم ایشیا کے ممالک مجموعی طور پر بھی اسلام کے لئے اتنی گراں بہا متاع نہیں جتنی اکیلے ہندوستان کی ملتِ اسلامیہ۔ اس لئے ہمیں ہندوستان کے مسئلہ کو صرف اس نقطۂ نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیئے کہ ہندوستان میں اسلام کا کیا حشر ہوگا بلکہ اپنی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اس نقطۂ خیال سے بھی کہ ہماری موت اور حیات کا عالمِ اسلام پر کیا اثر ہوگا۔

اُن کی بصیرت نے یہاں تک کہہ دیا کہ:۔

مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مستقبل قریب میں ہندوستان میں شاید ایسے خطرناک حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمانوں کو اپنا جداگانہ محاذ قائم کر کے ان کا مقابلہ کرنا پڑے۔

سچ کہا تھا اس دیدہ ور نے کہ ؎

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

اُس وقت کے حالات کے مطابق اس مسئلہ کا انہوں نے عملی حل یہ بتایا کہ:۔

## پاکستان کا ہیولیٰ

میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے..... مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔

اس مملکت کے قیام سے ہوگا کیا؟ فرمایا کہ:۔

اس سے اسلام کو اس امر کا موقعہ ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی ملوکیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کی صحیح معنوں میں تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔

اسی حقیقت کو انہوں نے اپنے خطبات تشکیلِ جدید (کے چھٹے خطبہ) میں سعید حلیم پاشا (مرحوم) کی ہمنوائی میں، ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:۔

---

[1] اُس زمانے میں ہندوستان میں مسلمانوں کی اتنی ہی تعداد تھی۔

اندریں حالات ہمارے لئے کشادِ کار کی ایک ہی راہ ہے۔ اور وہ یہ کہ آئینۂ اسلام پر غیر اسلامی رنگ کی جو سخت اور درشت تہیں جم گئی ہیں، اور جس کی وجہ سے اس کا حرکیاتی اور ارتقائی نظریہ یکسر جامد ہو کر رہ گیا ہے، انہیں کھرچ کھرچ کر الگ کیا جائے، اور حریت، سالمیت اور مساوات کی حقیقی اقدار کو از سرِ نو زندہ کر کے، ان کی بنیادوں پر اپنے اخلاقی، عمرانی اور سیاسی نظام کی تشکیلِ جدید کی جائے۔ جو حقیقی اسلام کی سادگی اور آفاقیت کا آئینہ دار ہو۔

آپ نے غور فرمایا کہ علامہ اقبالؒ نے مملکتِ پاکستان کا جو نظریہ اور تصوّر پیش کیا تھا اس کی غرض و غایت اور منتہا و مقصود کیا تھا؟ انہوں نے یہ تصوّر ۱۹۳۷ء میں پیش کیا تھا۔ (اگرچہ خطبات تشکیلِ جدید اس سے بھی دو سال پہلے دیئے گئے تھے۔) حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ کا سارا کلام اور پیام انہی تصورات کی توضیح و تشریح ہے۔

---

اسلامی مملکت کی بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں ایک، واحد اور غیر منقسم اُمت ہوتی ہے جو دین کے اشتراک کی بنا پر وجود میں آتی ہے۔ اس میں نہ مذہبی فرقے ہوتے ہیں نہ سیاسی پارٹیاں۔ اس مملکت یا اُمت کا ایک ضابطۂ قوانین ہوتا ہے جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوتا ہے۔ اس میں نہ پرسنل لاز اور پبلک لاز کی تمیز و تفریق ہوتی ہے، اور نہ ہی کوئی گروہ اس کا مطالبہ کر سکتا ہے کہ وہ اپنی الگ فقہ کی پیروی کرے گا۔ ایک مملکت کے اندر الگ الگ ضوابط قانون کی پیروی تو مملکت کے خلاف بغاوت کے مرادف ہوتی ہے جسے کبھی برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

## واحد ضابطۂ قوانین

لیکن جس مملکت کی تشکیل کا نظریہ علامہ اقبالؒ نے پیش کیا تھا، ظاہر ہے (اور انہیں اس کا علم تھا) کہ اس میں مسلمانوں کے متعدد فرقے ہوں گے۔ سوال یہ تھا کہ اس مملکت میں ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کس طرح ہو سکے گا جس کا اتباع تمام مسلمان یکساں طور پر کریں؟ سیکولر حکومت میں تو یہ مسئلہ بڑا آسان ہوتا ہے۔ اس میں مختلف مذاہب یا ایک ہی مذہب کے مختلف فرقوں کے پیرؤں کو، اپنے اپنے پرسنل لاز کی آزادی ہوتی ہے اور مملکت کے پبلک لاز کے وضع کرنے میں کسی مذہب کو دخل نہیں ہوتا۔ اس لئے ان کا اطلاق تمام باشندوں پر یکساں ہوتا ہے۔ لیکن اسلامی مملکت تو سیکولر نہیں ہوتی۔ اس میں اس قسم کی تفریق کا تصوّر ہی نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ بنظرِ غائر دیکھیں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ہندوستان کے نیشنلسٹ علماء کے سرخیل (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) اور علامہ اقبالؒ کے درمیان مشہور معرکۂ مملکت کے اسی (دو) جداگانہ تصورات کا پیدا کردہ تھا۔ نیشنلسٹ علماء سیکولر حکومت کے مؤید تھے اور علامہ اقبالؒ اسے اسلام کے یکسر خلاف قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک،

مسلمانوں کے لئے ایک الگ مملکت کے مطالبہ کی بنیاد ہی یہ تھی کہ وہ ہندوستان کی سیکولر حکومت کو خلافِ اسلام سمجھتے تھے۔ ان تصریحات سے آپ کے سامنے یہ حقیقت آگئی ہوگی کہ علامہ اقبالؒ نے جب اسلامی مملکت کا تصوّر پیش کیا تو ان کے سامنے بنیادی اور اہم ترین سوال یہ تھا کہ اس مملکت میں ایسا ضابطۂ قوانین کس طرح مرتب ہوگا جس میں پرسنل اور پبلک لاز کی تفریق نہیں ہوگی اور جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوگا۔ انہوں نے اپنے خطبات تشکیلِ جدید کے چھٹے خطبہ میں اس نہایت اہم اور نازک ترین مسئلہ پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ میں اس خطبہ کے ضروری اقتباسات پیشِ خدمتِ ناظرین کرنا چاہتا ہوں۔

---

لیکن کسی مملکت میں قرآنی قوانین و احکام کو میکانکی طور پر نافذ کر دینے سے وہ مملکت اسلامی نہیں بن جاتی۔ مملکت کے اسلامی بننے کی اوّلین شرط یہ ہے کہ اس کے افراد میں حکمتِ قرآنی کے مطابق نفسیاتی تبدیلی واقع ہو۔ ان کے قلب و دماغ میں قرآنی خطوط پر تغیر رونما ہو۔ یہ شرط خود قرآن مجید کی عائد کردہ ہے جب وہ کہتا ہے کہ: إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ (13/11)

## نفسیاتی تغیر۔ شرطِ اوّل

کسی قوم کی حالت کو، کوئی اور تو ایک طرف، خود خدا بھی نہیں بدلتا جب تک وہ قوم اپنے 'اندر' نفسیاتی تغیر پیدا کر لے۔ علامہ اقبالؒ کا سارا پیغام، اسی تغیرِ نفس کی شرح ہے جسے وہ تعمیر و استحکامِ خودی سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ وہ موضوع ہے جس پر ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ وہ (جاوید نامہ میں) کہتے ہیں کہ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست، چیزے دیگر است

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود — جان چو دیگر شد، جہاں دیگر شود

"چوں بجاں در رفت" سے مراد، قرآنی حکمت کے مطابق نفسیاتی تبدیلی ہے۔ خارجی تبدیلی اسی داخلی تبدیلی کے مطابق رونما ہوتی ہے۔ اسی کو وہ فاش تر الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں کہ:؎

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب — گرہ کشا ہے نہ رازیؔ، نہ صاحبِ کشّاف

(بالِ جبریل)

انسانی ضمیر پر "نزولِ کتاب" سے مراد بھی، قرآن کے مطابق تغیرِ نفس ہے۔ یہ مقصد، قرآنی حقائق کو اس طرح تعلیم و تربیت کی بنیاد بنا دینے سے حاصل ہو سکتا ہے کہ اس سے افرادِ ملّت کا قلب و دماغ قرآنی سانچے میں ڈھل جائے۔ اسی لئے وہ قرآن کے متعلق کہتے ہیں کہ ؎

آنچہ حق می خواہد، آں سازد ترا

وہ تجھے ویسا انسان بنا دیتا ہے جیسا انسان خدا چاہتا ہے۔ اور یہ مقصد احکامِ قرآنیہ کو میکانکی طور پر نافذ کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ؎

نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر

یہ بات قانون سازوں کے بس کی نہیں۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، یہ مقصد قرآنی خطوط پر تعلیم و تربیت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آغازِ نبوت ہی سے حضورؐ نبی اکرم کا فریضہ ۔ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۔ قرار دے دیا گیا تھا۔ یعنی آپؐ، کتاب و حکمت کی تعلیم سے ان کی تعمیرِ خودی کرتے تھے۔ تشکیلِ مملکت کا مرحلہ تو اس سے کہیں بعد جا کر آیا تھا۔ اور قرآنی مملکت قائم بھی انہی افراد کے ہاتھوں ہو سکتی تھی جن میں اس قسم کا نفسیاتی تغیر پیدا ہو چکا ہو۔ حضورؐ کی تیرہ سالہ مکی زندگی اسی پروگرام کی پہلی کڑی تھی۔

لیکن مملکت کا کاروبار تو بہرحال قوانین کی رو ہی سے چلنا ہے اس لئے اسلامی مملکت میں قانون سازی کا مسئلہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے، اور علامہ اقبالؒ نے بڑی شرح و بسط سے اس پر گفتگو کی ہے۔ اصولی طور پر وہ باصرار و تکرار اس حقیقت کو دہراتے جاتے ہیں کہ اسلامی مملکت کے آئین و قوانین کی بنیاد قرآن کریم ہوگا۔ وہ اپنی پہلی مثنوی (اسرار و رموز) میں کہتے ہیں کہ :-

> ہیچ می دانی کہ آئینِ تو چیست     زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست
>
> آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم     حکمتِ او لایزال است و قدیم

## قرآن کا انداز

لیکن قرآنِ کریم کا انداز یہ ہے کہ اس نے (بجز چند احکام) اصول اور حدود متعین کر دیئے ہیں اور جزوی اور تفصیلی قوانین خود ہی مقرر نہیں کر دیئے۔ اسے اس کتاب کی وارث اُمت (یعنی ان کی مملکت) پر چھوڑا ہے کہ وہ ان حدود کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، تفصیلی قوانین خود وضع کرے۔ یہ حدود و اصول تو ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن ان کے اندر وضع کردہ قوانین ہیں، زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق تبدیلی کی جا سکے گی۔

جس کتاب کو تمام زمانوں اور تمام قوموں کے لئے ابدی اور غیر متبدل ضابطہ راہ نمائی قرار پانا ہو، اسے ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ اسلامی مملکت کے لئے قانون سازی کا یہ وہ بنیادی نکتہ ہے جسے علامہ اقبالؒ نے بڑی شد و مد سے دہرایا ہے۔ وہ خطباتِ تشکیلِ جدید (کے چھٹے خطبے میں) کہتے ہیں :-

## ثبات و تغیّر کا امتزاج

> اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس، ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصوّر پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر (جیسے متضاد عناصر) میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس، اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا

دَور دَورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں۔ ــــ وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے ــــ تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد و متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر مستبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغییر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع اور ترکیب میں کون سا اصولِ حرکت کار فرما ہے؟ یہ وہی اصول ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں۔

اس کے بعد وہ اس خطبہ میں مسئلہ اجتہاد پر بڑی تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ وہ اجتہادِ مطلق کو اسلام کا بنیادی اصول قرار دیتے ہیں۔ یعنی قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے قانون سازی کا کُلی اختیار۔ وہ اس اجتہاد کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

سُنّی حضرات نظری طور پر تو اس کے قائل ہیں کہ اس قسم کا اجتہاد ممکن ہے۔ لیکن ائمۂ فقہ کے مذاہب کے قیام کے بعد عملاً اس کا دروازہ بند ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کے اجتہاد کے لئے جن شرائط کو ضروری قرار دیا جاتا ہے، اُن کا پورا کرنا کسی ایک فرد کے لئے قریب قریب ناممکن ہے۔ ایک ایسے نظامِ شریعت میں، جس کی بنیاد قرآن پر ہو جو زندگی کے متعلق حرکیاتی اور ارتقائی تصوّر کا علمبردار ہے، اس قسم کی ذہنیت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اسباب و علل کا انکشاف کریں جن کی وجہ سے یہ ذہنیت پیدا ہوئی جس نے قانونِ شریعت کو یکسر منجمد بنا کر رکھ دیا۔

میں اس وقت ان اسباب و علل کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا جنہیں علامہ اقبالؒ نے اس جمود و تعطّل کا ذمہ دار گردانا ہے۔ میں ان میں سے دو ایک اہم نکات پر اکتفا کروں گا۔ وہ (اپنے اس خطبہ میں) لکھتے ہیں:۔

## قانون سازی کے لئے قرآنی اصول

آیئے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی رُو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس، ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہ نمائی سے ہمارے قدیم فقہا نے، قانونِ شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے۔ اور تاریخِ اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظامِ زندگی کی

حیثیت سے اسلام کو جو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی تو اس کا کم از کم آدھا حصہ انہی فقہا کی بالغ نظری کا رہینِ منت تھا۔ چنانچہ خان کرتیر اس ضمن میں لکھتا ہے کہ :۔

رومیوں کو چھوڑ کر دنیا میں سوائے عربوں کے اور کوئی قوم ایسی نہیں جس کے پاس اس قدر احتیاط سے مرتب کردہ قانونی نظام ہو۔

لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود، یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انہیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علمائے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور مذاہب (اربعہ) اپنی اپنی جگہ مکمل اور مختتم ہیں۔ لیکن نظری طور پر اجتہادِ مطلق کے امکان سے انہیں بھی کبھی انکار نہیں ہوا۔ میں نے (پچھلے صفحات میں) ان اسباب و علل سے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیت کا موجب بنے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں، اور دنیائے اسلام ان تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکرِ انسانی کی نشو و ارتقاء سے وجود میں آ گئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہبِ فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعبیرات و تاویلات کو کبھی قطعی، کامل، مختتم اور سہو و خطا سے مبرّا سمجھا ہے؟ کبھی نہیں۔ اس لئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان، زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں، فقہ کے اصولِ اساسی کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طریقِ عمل میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عملِ ارتقاء ہے، اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی لے سکتے ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔

وہ اس قسم کی ماضی پرستی کو تاریخ کا جھوٹا احترام قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ کہتے ہیں کہ :۔

قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیائے سے نہیں ہو سکتا جیسا کہ دورِ حاضر کے ایک مصنف نے لکھا ہے کہ :۔

"تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں، ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے جنہوں نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہو۔

تیرھویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی جھوٹی تقدیس سے جماعتی نظم کو جامد اور متصلب طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا۔

اور اس نکتہ کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں :۔

اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا، اسلام کے خلاف افترا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوئی

کہ مسلمانوں میں قانون کے تصور نے ایک خاص معین شکل اختیار کر لی۔ اور ایک وجہ یہ کہ قوموں کے زوال کے زمانہ میں ذہنوں میں اس قدر جمود اور تساہل پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین کو (انسان سمجھنے کے بجائے) معبود بنا دیا جاتا ہے۔ اگر علمائے متاخرین میں سے بھی بعض نے اس "افتراء" کو برقرار رکھا ہے تو وہ ان کا اپنا فعل ہے۔ دورِ حاضر کا مسلمان اس کا پابند نہیں کہ جس طرح انہوں نے برضا و رغبت اپنی فکری آزادی کو (اپنے خود ساختہ معبودوں کی) نذر کر دیا تھا۔ یہ بھی اپنی آزادی کو سلب ہو جانے دیں۔ علامہ سرخسیؒ (دسویں صدی میں) لکھتے ہیں:۔

> اگر اس افتراء کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے زمانے کے مفکرین و مصنفین کو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں، اور ان کے مقابلہ میں متاخرین کے راستے میں بہت سی دشواریاں ہیں، تو ایسا سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ اس لئے کہ اس معمولی سی بات کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ متقدمین کے مقابلہ میں متاخرین کے لئے اجتہاد زیادہ آسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب قرآن اور سنت کی اس قدر تفسیریں اور شرحیں لکھی جا چکی ہیں کہ ہمارے زمانے کے مجتہد کے پاس، تعبیرات کے لئے کافی سے زیادہ مسالہ موجود ہے (جو متقدمین کے پاس نہیں تھا۔)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک، مروجہ فقہ (خواہ وہ کسی فرقہ کی فقہ ہو) ناقابلِ تغیر نہیں۔ اس میں قرآن کی روشنی میں، موجودہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق، تبدیلیاں از بس ضروری اور ناگزیر ہیں۔ لیکن ایسا کہتے وقت وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں تھے کہ:۔

> بدقسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ فقہ کے متعلق کسی ناقدانہ گفتگو کے لئے تیار نہیں۔ اگر اس قسم کی بحث چھیڑی جائے تو بہت سے لوگوں کے لئے ناگواری کا باعث ہو جائے گی۔

لیکن انہوں نے کہا کہ:۔

> با ایں ہمہ، میں مسئلہ زیرِ نظر کے متعلق چند معروضات پیش کرنے کی جسارت ضرور کروں گا۔ سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ قرنِ اوّل سے لے کر عباسیوں کے زمانے کے آغاز تک مسلمانوں میں قرآن کے سوا کوئی تحریری قانون موجود نہیں تھا۔

علامہ اقبالؒ کی یہی جسارت تھی جس کی وجہ سے وہ اربابِ دانش کی نگاہوں میں اس قدر واجب التکریم و تحریم بن گئے تھے۔ خود انہی کے الفاظ میں:۔

آئینِ جواں مرداں، حق گوئی و بیباکی — اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

---

یہاں تک بحث فقہ کے متعلق تھی۔ لیکن اس سے کہیں نازک مقام وہ ہے جہاں احادیث کا سوال

سامنے آتا ہے۔ فقہ کی نسبت تو پھر بھی غیراز انبیاؑ حضرات کی طرف ہوتی ہے، لیکن جب بات ان ارشادات و اعمال کے متعلق ہو جن کی نسبت رسول اللہؐ کی طرف کی جائے، تو ان کی بابت یہ کہنا کہ اسلامی مملکت ان میں بھی تبدیلی کر سکتی ہے، بہت بڑی جرأت کا متقاضی ہے۔ مبداء فیض کی یہ انتہائی کرم گستری تھی کہ اس نے علامہ اقبالؒ کو اس قسم کی جرأت و بسالت سے بھی نوازا تھا — چنانچہ انہوں نے اس سوال پر بھی (اپنے خطبہ میں) بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس باب میں وہ لکھتے ہیں:-

## احادیث کی قانونی حیثیت

احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔

اول الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم و رواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ صلعم نے علیٰ حالہٖ رکھا اور بعض میں ترمیم فرما دی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور معلوم کیا جا سکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانہ قبل از اسلام کے رسوم و رواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم و رواج کو رسول اللہؐ نے علیٰ حالہٖ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرما دیا ہو) انہیں ہمیشہ کے لئے نافذالعمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریقِ تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسولؐ کے احکام ان لوگوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اس کے اوّلین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کر دے لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جا سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں بغیر کسی اصول کے چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مسالک زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کر لیں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رُو سے رسول کے احکام، اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی، انہیں آنے والی نسلوں پر من و عن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابوحنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے) اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا

مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے احادیث کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ ان کے زمانہ میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اوّل تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالکؒ اور زہری کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحبؒ تک پہنچ نہیں پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں، تو اگر امام صاحبؒ اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے، جیسا کہ امام مالکؒ اور ان کے بعد امام احمد بن حنبلؒ نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں، میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے، امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابوحنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔

احادیث کے متعلق امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل اور علامہ اقبالؒ کی طرف سے اس کی "تائید" قرآنِ کریم کی تعلیم کے عین مطابق تھی۔ دین کے اصول حضور نبی اکرمؐ کو خدا کی طرف سے بذریعۂ وحی عطا ہوئے تھے۔ ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن دین کے ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طور طریقے، بذریعہ وحی متعین نہیں ہوئے تھے۔ ان کے متعلق حضورؐ کو حکم خداوندی تھا کہ:۔

شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔ (۳/۱۵۹) ان کا تعین اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ سے کیا کرو۔

اب ظاہر ہے کہ جو امور باہمی مشاورت سے طے ہوں، وہ وحی کی طرح ابدی اور غیر متبدل نہیں ہو سکتے۔ حضورؐ نے بھی ان جزئیات کو صحابہؓ کے ساتھ مشورہ سے طے فرمایا، اور حضورؐ کے بعد جماعتِ مومنین کے متعلق بھی کہا گیا کہ:۔

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) یہ اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کریں گے۔

یہ طریقِ عمل دورِ خلافتِ راشدہ میں جاری رہا۔ اُس وقت تک یہ بات کسی کے حیطۂ خیال میں بھی نہیں تھی کہ یہ فیصلے ابدی طور پر غیر متبدل رکھے جائیں گے۔ یہ تصور خلافتِ راشدہ کے باقی نہ رہنے کے بعد پیدا ہوا۔

احادیثِ رسول اللہؐ (اور ان کے مطابق صحابہؓ کے عمل) کو ابدی طور پر غیر متبدل قرار دینے کا تصور امام مالکؒ اور ان سے کہیں بڑھ کر امام شافعیؒ نے پیش کیا تھا ــــــ اس مسلک پر امام ابوحنیفہؒ نے کڑی تنقید کی اور قیاس کو قانون کا ماخذ قرار دیا۔ قیاس سے مراد ہے کسی حکم یا فیصلہ کو عقل و بصیرت کی رو سے اس سے ملتے جلتے حالات پر منطبق کرنا ــــــ علامہ اقبالؒ ان کی اس نزاع پر گفتگو کرتے ہوئے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے متعلق لکھتے ہیں :۔

انہوں نے اپنے آپ کو صرف ان نظائر کے دائرہ میں محدود کر لیا جو عہدِ رسالتمآب اور عہدِ صحابہؓ میں وقوع میں آئے تھے۔ اس سے ان کی نگاہ کا دائرہ بہت تنگ ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے بات تو یہاں سے شروع کی تھی کہ اہمیت مقدس واقعات کو حاصل ہے۔ لیکن انہوں نے (ایک خاص دور کے) مقدس واقعات کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لیا، اور خاص واقعات سے متعلق احکام کو اس قسم کے ملتے جلتے واقعات پر منطبق کرنے کے لئے قیاس سے شاذ و نادر کام لیا۔ ان کے برعکس، ان کی سخت تنقیدیں مذہبِ حنفیہ کے لئے (ایک اور رنگ میں) بڑی مفید ثابت ہوئیں۔ اس سے انہوں نے محسوس کر لیا کہ اصولِ قانون سازی کی تعبیریں، زندگی کی حقیقی (واقعاتی) نقل و حرکت اور تنوع کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مکتبِ فقہ، جس نے ان مباحث کے نتائج کو اچھی طرح جذب کر لیا تھا، اپنے خاص الخاص اصولِ فقہ میں بالکل آزاد ہے اور دیگر مذاہبِ فقہ و تشریع کے مقابلہ میں، حالات سے مطابقت کی بڑی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔

اور اس کے بعد وہ کہتے ہیں:۔

لیکن جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے، خود اپنے مکتبِ فقہ کی روح کے خلاف، امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے، بعینہٖ اسی طرح جس طرح امام ابوحنیفہؒ پر تنقید کرنے والوں نے اُن فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے لیا تھا جو عہدِ رسالتمآبؐ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ مقدمات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے تھے۔

---

ان تصریحات سے، عزیزانِ من! یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک اسلامی مملکت میں قانون سازی کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ابدی اور غیر متبدل قرآنی احکام و اصول و حدود ہیں۔ ان حدود کے اندر جو فیصلے ماضی میں کئے گئے تھے، یا جو بعد کی اسلامی مملکت کرے، ان میں تغیر و تبدّل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن انہیں اس کا بھی بخوبی احساس تھا کہ ایسا کرنے کے لئے بڑی جرأت و بسالت کی ضرورت ہوگی۔ اس باب میں وہ کہتے ہیں کہ:۔

وہ سب سے بڑا سوال جو اِس وقت اُس کے (ترکی کے) اور جو زود یا بدیر دیگر مسلم اقوام کے ——— سامنے آنے والا ہے، یہ ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جد و جہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات (ہاں) میں ہونا چاہیئے بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ:۔

**روحِ عمریؓ**

حسبنا کتاب اللہ

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔

وہ اپنے اس خطبہ کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتے ہیں :-

اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بنا پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہیئے۔ پہلے زمانے کے مسلمان جو ایشیائے قبل از اسلام کی روحانی غلامی سے (نئے نئے) آزاد ہوئے تھے، اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ (ختمِ نبوت کے) اس بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دورِ حاضر کے مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سے سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرہ کی تشکیلِ جدید کرے، اور وہ عالم گیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل و غایت ہے، لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔

ان کے نزدیک اس سوال کو اس قدر اہمیت حاصل تھی کہ انہوں نے اپنے خطبات سے بھی پہلے، امرت سر کے حلقۂ اہلِ قرآن کے متعلق ذکر کرتے ہوئے صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ :-

ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادتِ انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔ نیز جو جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص مؤخر الذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت تک مروج ہیں، ان پر قرآنی نقطۂ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوعِ انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے "جورس پروڈنس" یعنی اصولِ فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔ قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں، یا قوانینِ اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں (سوائے ایران و افغانستان کے) مگر ان ممالک میں بھی امروز و فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ زمانہ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں ایران میں مجتہدینِ شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکامِ قرآنی کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا نظیر ناممکن ہے۔ غرضیکہ یہ وقت عملی کام کا ہے کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہبِ اسلام گویا زمانے کی کسوٹی

پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخِ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔

انہوں نے سید سلیمان ندوی (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں بھی اس اہمیت کو دہراتے ہوئے لکھا کہ:-

> قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے لیکن ضرورت ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیاسیاتِ انسانیہ کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں۔ اور اس میں فلاں فلاں آیت سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔
>
> (طلوع اسلام ۔ اپریل [illegible] ۔ ص [illegible])

علامہ اقبالؒ عمر بھر اسی پیغام کو عام کرتے رہے۔ اور ان کی وفات کے بعد اس پیغامِ خداوندی کی نشر و اشاعت کی سعادت اس ہیچ میرز کے حصہ میں آئی۔ اقبالؒ کی زندگی میں اس مسئلہ کی حیثیت ہنوز نظری تھی۔ یعنی انہوں نے اسلامی مملکت کا یہ نظریہ تو پیش کر دیا تھا لیکن اس مملکت کے وجود میں آنے کا بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا' اس لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ان کے ان خیالات و تصورات کو نہ کوئی خاص اہمیت دی گئی اور نہ ہی ان کی خصوصیت سے مخالفت کی گئی۔ لیکن اب جبکہ یہ مملکت وجود میں آ چکی ہے مذہبی پیشوائیت کی طرف سے قانون سازی کے اس تصور کی بڑی شدت سے مخالفت ہو رہی ہے۔ میرے خلاف ایک ہزار "علماء" کا کفر کا فتویٰ اسی مخالفت کی زندہ شہادت ہے۔ لیکن قرآنِ مجید تو ایک ابدی حقیقت ہے۔ اس کا سررشتہ نہ علامہ اقبالؒ کی طبیعی عمر سے وابستہ تھا، جو ان کی وفات سے یہ ٹوٹ جاتا۔ نہ ہی یہ میری زندگی تک محدود ہے۔ اور نہ ہی اسے مخالفین کی کاوشیں اور کوششیں ناکام بنا سکتی ہیں۔ اسے دنیا کے ہر نظام پر غالب آ کر رہنا ہے کہ: لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ۔ اس خدا کا فیصلہ ہے جس نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے رکھا ہے۔ لہٰذا ایسا بالآخر ہو کر رہے گا۔ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (۹/۳۳) اور قوانینِ خداوندی کے ساتھ دیگر قوانین ملانے والوں کی تمام کوششوں کے علی الرغم ایسا ہو گا۔

---

جو کچھ میں نے عرض کیا ہے، مناسب سمجھتا ہوں کہ آخر میں اُسے مختصر الفاظ میں سمٹا کر آپ کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔

۱۔ حضرات انبیاء کرامؑ کو خدا کی طرف سے ایک ضابطۂ قوانین و آئین عطا ہوتا تھا۔ جو قوم اس ضابطہ کی صداقت کو تسلیم کر لیتی تھی اس کا فریضہ ہوتا تھا کہ وہ اُسے عملاً نافذ کرے۔ چونکہ یہ پوری قوم ایک ضابطہ کے تابع زندگی بسر کرتی تھی اس لئے اس میں کسی قسم کے اختلاف اور تفرقہ کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔

۲۔ رسولؑ کے چلے جانے کے بعد، وہ قوم اس ضابطہ میں آمیزشیں کر دیتی تھی اور اس طرح ان میں اختلافات نمودار ہو جاتے تھے۔ اس طرح وہ دین مذہب بن جاتا تھا۔ یہ جو دنیا میں مختلف مذاہب پائے جاتے ہیں، یوں سمجھئے کہ یہ دین میں پیدا شدہ مختلف فرقے ہیں کیونکہ دین تو شروع سے آخر تک ایک ہی تھا۔ دین کی اطاعت کرنے والوں میں فرقے پیدا ہو ہی نہیں سکتے۔

۳۔ یہ دین آخری مرتبہ، مکمل اور غیر متبدل شکل میں نبی اکرمؐ کی وساطت سے ملا۔ جن سعادت مند افراد نے اس کی صداقت کو تسلیم کر لیا وہ ایک قوم (یا اُمت) بن گئے۔ اس اُمت نے، اس دین کو عملاً نافذ کرنے کے لئے ایک مملکت کی تشکیل کی جس کا ضابطۂ آئین قرآن کریم تھا۔ اس مملکت کی مرکزی اتھارٹی اُمت کے مشورہ سے اس دین پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق وضع کرتی اور انہیں قوانینِ مملکت کی حیثیت سے نافذ کرتی۔ ان کا اطلاق تمام اُمت پر یکساں طور پر ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس نظام میں اُمت میں مختلف فرقوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ مختلف فرقوں کے معنی تو یہ تھے کہ مختلف گروہ، مملکت کی طرف سے نافذ کردہ قوانین کے بجائے، اپنے اپنے وضع کردہ قوانین کی اطاعت کرتے۔ ایک مملکت کے اندر رہتے ہوئے اس قسم کا طرزِ عمل تو مملکت سے بغاوت کے مرادف ہوتا ہے۔ یہ وجہ ہے جو قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے۔ (۳۰/۳۱) یعنی ایک اتھارٹی (حکومتِ قرآنی) کی اطاعت کرنے کے بجائے، مختلف اتھارٹیز کی اطاعت کرنا۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جو لوگ فرقے پیدا کر لیں تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں رہے گا۔ (۶/۱۴۹) یعنی جو مملکتِ اسلامیہ کی مرکزی حیثیت ہی کو تسلیم نہ کریں ان کا اس مرکز سے تعلق کیا؟ وہ تو اس کے باغی قرار پاتے ہیں۔ چونکہ مرکزِ ملّت کے فیصلے قرآن کے مطابق ہوتے تھے، اور فرقوں میں فیصلے اپنی اپنی فقہ کے مطابق ہوتے ہیں، اس لئے کہہ دیا کہ جو لوگ ــــ ما انزل اللہ ــــ (قرآن مجید) کی رو سے فیصلے نہیں کرتے انہیں مومن نہیں کہا جا سکتا۔ (۵/۴۴)

۴۔ ہمارے سامنے ہوا یہ ہے کہ اُمت کی مرکزی اتھارٹی (حکومتِ خداوندی یا خلافت علیٰ منہاج رسالت) کے باقی نہ رہنے سے دین، مذہب میں تبدیل ہو چکا ہے، اس لئے اس میں مختلف فرقے پیدا ہو چکے ہیں۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ان فرقوں کو باقی رکھتے ہوئے اسلامی نظام (یعنی دینِ خداوندی) قائم ہو سکتا ہے تو وہ یا تو دین اور مذہب میں فرق کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور یا پھر اُمت کو فریب میں مبتلا رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ فرقوں کی موجودگی میں دین کا نظام قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ دین کا نظام قائم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ایک ایسی مملکت کا قیام عمل میں آئے جو قرآنی اصولوں کو مملکت کا آئین قرار دے۔ اُمت کے مشورہ سے ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق وضع کرے۔ انہیں قوانینِ حکومت کی حیثیت سے تمام مسلمانوں پر یکساں نافذ کرے ــــ اس میں نہ اس فرقے یا اُس فرقے کی کوئی تمیز ہو اور نہ ہی پرسنل اور پبلک لاز کی تفریق ــــ اس طرح ایک خدا ــــ ایک ضابطۂ قوانین اور ایک اُمت کی تشکیل سے، دین کا نظام قائم ہوگا۔ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو احیاءِ اسلام کی ہر کوشش رائیگاں جائے گی۔

یہ تھی خلافتِ راشدہ کے بعد اسلامی مملکت کے قیام کی وہ ممکن العمل شکل جسے علامہ اقبالؒ نے پیش کیا اور جس کے مطابق ایک خطۂ زمین کے حصول کے لئے قائدِ اعظمؒ، تحریکِ پاکستان کو وجود میں لائے۔ وہ علامہ اقبالؒ کے پیش کردہ بنیادی اصول کو کس طرح واضح طور پر سمجھ چکے تھے، اس کی تفاصیل میں اپنے اس خطاب میں پیش کر چکا ہوں جسے میں نے سابقہ یوم پاکستان (مارچ ۱۹۷۶ء) کی تقریب پر پیش کیا تھا۔ (وہ الگ شائع ہو چکا ہے) انہوں نے ان تمام تفاصیل کو ان چار لفظوں میں جامع طور پر

سمیٹ کر رکھ دیا تھا کہ :-

قرآنِ کریم کے احکام ہی ہماری سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔

یہ وہ حدود ہیں جو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہتے ہیں، اور ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، ملتِ اسلامیہ اپنی مملکت کے لئے قوانین و ضوابط وضع کرتی ہے جن کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی مملکت وجود میں نہیں آ سکتی؛ اور اگر وجود میں آ جائے تو مستحکم نہیں رہ سکتی، جب تک اس میں ایک (واحد) ضابطۂ قوانین نافذ نہ ہو۔ جس مملکت میں مختلف گروہ اپنے لئے الگ الگ قوانین وضوابط وضع کرلیں، اس میں انارکی پھیل جاتی ہے۔ سیکولر اسٹیٹ میں قانون سازی کا مسئلہ آسان ہوتا ہے۔ اس میں مختلف مذہبی گروہوں کو ان کے اپنے شخصی قوانین پر عمل پیرا ہونے کی آزادی دے دی جاتی ہے اور پبلک لاز کا ضابطہ، بلاتمیزِ مذاہب، آزادانہ وضع کر لیا جاتا ہے جس کا اطلاق تمام باشندوں پر یکساں ہوتا ہے۔ لیکن اسلام میں نہ تو پرسنل لاز اور پبلک لاز میں تفریق ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے پبلک لاز بلا حدود و قیود جس طرح جی چاہے وضع کئے جا سکتے ہیں۔ یہ سب قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے وضع کئے جاتے ہیں۔

لیکن اس وقت صورت یہ ہے کہ مسلمان مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ہر فرد اپنی اپنی فقہ پر شدت سے جما بیٹھا ہے۔ ان کی فقہ کا دائرہ، شخصی قوانین تک محدود ہے۔ انگریزوں کے عہدِ حکومت میں، انہیں شخصی قوانین کی آزادی تھی اور پبلک لاز سیکولر انداز سے وضع ہوتے تھے۔ ہماری مذہبی پیشوائیت اس پر مطمئن تھی۔ جسے ہندوستان کی تحریکِ آزادی کہا جاتا ہے، اس سے مراد انگریزوں کی جگہ، اہلِ ہندوستان کی اپنی حکومت قائم کرنا تھا۔ اس تحریک میں، وہاں کی اکثریت، ہندوؤں نے، اس امر کی ضمانت دیدی تھی کہ حصولِ آزادی کے بعد، قوانینِ مملکت کی شکل وہی رہے گی جو انگریزی عملداری میں رائج تھی ——— یعنی مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے شخصی قوانین اپنے اپنے ہوں گے، اور ملک کے پبلک لاز سیکولر انداز سے وضع ہوں گے۔ وہاں کے علماء کی اکثریت کا تعلق دارالعلوم دیوبند سے تھا۔ وہ جس طرح انگریزی عملداری میں اس نہجِ حکومت سے مطمئن تھے اور اُسے قطعاً اسلام کے منافی نہیں سمجھتے تھے، اسی طرح وہ ہندوؤں کے پیش کردہ نہجِ حکومت کو اسلام کے منافی نہیں سمجھتے تھے اس لئے وہ اس تحریک میں بہ ہیئتِ مجموعی شامل تھے۔ اصل یہ ہے کہ فرقہ وارانہ گروہ بندی میں، ہر فرقہ کے نزدیک اس کے اپنے معتقدات، مسالک، رسوم، اور شخصی قوانین کا نام اسلام ہوتا ہے۔ اگر اسے ان کا تحفظ حاصل ہو جائے تو وہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ اسلام محفوظ ہے۔ اور اگر ان پر کوئی زد پڑتی ہو تو وہ چلّا اٹھتا ہے کہ اسلام خطرے میں ہے۔ اس سے زیادہ اسلام کا کوئی تصور ان کے سامنے نہیں ہوتا۔ یہ شکل سیکولر نظامِ حکومت ہی میں قائم رہ سکتی ہے۔ اس کے برعکس، اسلامی نظامِ مملکت میں فرقوں کا وجود باقی نہیں رہتا۔ اس میں (واحد) اُمتِ مسلمہ ہوتی ہے جو ایک ہی

ضابطۂ قوانین کے تابع زندگی بسر کرتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ فرقہ بندی کو اسلام قرار دینے اور اس پر مطمئن ہو جانے والے علماء سکولر اندازِ حکومت ہی کے مؤید ہو سکتے ہیں۔

---

یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں۔ ہندوستان کے نیشنلسٹ اخبار مدینہ (بجنور) کی ۱۷ اپریل ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں، مولانا اسرار احمد آزاد (دیوبندی) کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ:-

یہ الزام بے بنیاد ہے کہ علمائے ہند اس ملک میں اسلامی حکومت کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے علماء نے کم از کم اس صدی کے آغاز سے ہندوستان میں جمہوری اور سیکولر حکومت کے قیام کو اپنا واضح نصب العین قرار دے لیا تھا۔

انہی علماء کے سرخیل (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) تھے جن کا مسلک یہ تھا کہ:-

ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، سب شامل ہوں حاصل کرنے کے لئے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیئے۔ ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصولوں کے عین مطابق ہے اور اسلام اس آزادی کی اجازت دیتا ہے۔

(زمزم۔ مورخہ ۷ر جولائی ۱۹۳۸ء)

اس کے برعکس، قائداعظمؒ، علامہ اقبالؒ کے تصور کے مطابق اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے مصروفِ جہد و جہد تھے۔ ظاہر ہے کہ "علماء" کی طرف سے اس تحریک کی مخالفت فطری امر تھی۔ یہ ان کے "تصورِ اسلام" کے خلاف تھی۔ یہ تھی ہندوستان میں، تحریکِ پاکستان اور علماء کے درمیان کھلی ہوئی جنگ کی حقیقی وجہ۔ پاکستان وجود میں آ گیا اور علماء کا گروہ ادھر آ گیا۔

---

یہاں بھی ان کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے تصور کی اسلامی حکومت قائم نہ ہونے پائے۔ کیونکہ اس سے ان کے فرقہ وارانہ اسلام کی اجارہ داری جاتی نہیں رہتی۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ یہ حضرات ہر فرقہ کے پرسنل لاز کی آزادی کا چرچا تو ہر جگہ کرتے ہیں لیکن پبلک لاز کے ضابطہ کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ یہ یہاں اُسی انداز کی سیکولر حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جس کے داعی (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) اور ان کے ہمنوا حضرات تھے۔ اس قسم کی حکومت میں اگر اقتدار ان کے ہاتھ میں ہو، تو یہ اسے اسلامی حکومت قرار دینگے۔ اگر اقتدار کسی اور کے ہاتھ میں ہو تو وہ غیر اسلامی حکومت ہوگی۔

---

ان کے علاوہ تحریکِ پاکستان ——— کے خلاف ایک اور عنصر بھی کارفرما تھا۔

——— یعنی جماعت اسلامی۔

مطالبۂ پاکستان کی بنیاد دو اصولوں پر تھی۔ ایک یہ کہ مسلمان، ایمان کے اشتراک کی بنا پر، غیر مسلموں سے ایک الگ قوم ہیں۔ اور (۲) ہمارے دین کا تقاضا ہے کہ ایک ایسی مملکت قائم کی جائے جس میں اسلام

ایک زندہ حقیقت بن سکے۔

اس جماعت کے بانی، ابوالاعلیٰ، مودودی صاحب کی کوشش تھی کہ یہ ثابت کر دیا جائے کہ یہ دونوں دعاوی باطل ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان، محض پیدائشی مسلمان ہیں، حقیقی مسلمان نہیں۔ لہٰذا ان کا، اسلام کی بنیاد پر جداگانہ قومیت کا دعویٰ ہی باطل ہے۔ دوسرے مطالبہ کے متعلق انہوں نے کہا کہ یہ لوگ جس حکومت کے قیام کے لئے پاکستان کا مطالبہ کر رہے ہیں، وہ اسلامی حکومت نہیں بلکہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ بلکہ اس سے بھی بدتر، لہٰذا، اس بنا پر بھی ان کا دعویٰ باطل ہے اور یکسر غیر اسلامی۔

ان کا اس جہد وجہد کے باوجود پاکستان وجود میں آگیا تو یہاں انہوں نے یہ کوشش شروع کی کہ مسلمانوں کی نئی نسل کے دل میں یہ خیال راسخ کر دیا جائے کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے۔ اس زمانے میں اسلامی حکومت کا قیام ناممکنات میں سے ہے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ اسلامی مملکت کے قیام کی شرطِ اوّلین یہ ہے کہ اس میں پبلک لاء کا ایسا ضابطہ وضع کیا جائے جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے۔ اسے ناممکن ثابت کرنے کے لئے مودودی صاحب نے ایک خاص انداز اختیار کیا۔ بیس پچیس سال تک وہ یہ کہتے رہے کہ اسلامی حکومت کی بنیاد "کتاب و سنت" پر ہے۔ یہ بڑا معصوم اور مقدس نعرہ تھا جس کی بلم کو سادہ لوح مسلمان سمجھ نہ سکا۔ جب وہ "کتاب و سنت" کی اہمیت اس طرح ثبت کر چکے تو اس کے بعد فرمایا کہ "کتاب و سنت" کی رو سے پبلک لاء کا کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں۔ کھلے الفاظ میں اس کا مفہوم اس کے سوا کیا ہے کہ اب دنیا میں اسلامی حکومت قائم ہو ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ اُن کے پیش کردہ اس نظریہ کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری نئی نسل، اسلام کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہو چکی ہے۔ ان نوجوانوں نے کہنا شروع کر دیا ہے کہ جب اسلامی حکومت قائم ہی نہیں ہو سکتی تو پھر پاکستان کی جداگانہ مملکت کی ضرورت کیا تھی! ہماری نئی نسل کے دلوں میں ان خیالات نے پرورش پانا شروع کر دیا ہے۔ یہ خیالات ذرا پروان چڑھے تو یہاں یہ تحریک اُبھرے گی کہ ہمیں ہندوستان کے ساتھ مل جانا چاہیئے تاکہ روز روز کے درد سر سے چھٹکارا حاصل ہو۔ مودودی صاحب ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اس کے ایک حصّہ میں مملکتِ پاکستان قائم کرنے کے خلاف تھے اور اپنے اس نظریہ کی تائید میں کہا کرتے تھے۔ کہ ــــ

> یہ لوگ ہندوستان کے ایک ذرا سے کونے میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بنائے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر یہ فی الواقعہ خلوصِ قلب سے اسلام کی نمائندگی کے لئے کھڑے ہو جائیں تو سارا ہندوستان، پاکستان بن سکتا ہے۔ (روئداد جماعت اسلامی۔ حصّہ پنجم۔ ص۶۵)

# صرف ایک سوال

آپ ان حضرات سے صرف ایک سوال پوچھئے۔ اور وہ یہ کہ:-

کیا کتاب و سنت کی رُو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کیا جا سکتا ہے جسے یہاں کے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں؟

مودودی صاحب تو واضح الفاظ میں کہہ چکے ہیں کہ ایسا کیا جانا ناممکن ہے۔ لیکن اگر دیگر علماء حضرات اسے ممکن سمجھتے ہوں تو ان سے کہیئے کہ ان کا اولین دینی فریضہ یہ ہے کہ وہ ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کر دیں۔ اس سے وہ تمام مسائل حل ہو جائیں گے جو گذشتہ پچیس برس سے ساری قوم کے لئے سوہانِ روح بن رہے ہیں۔

*

# مرغدین (ملکِ خدداد)

میں نے اس خطاب کو قانون سازی کے اصولوں تک محدود رکھا ہے۔ یہ نہیں بتایا کہ جس خطۂ ارض میں اسلامی مملکت قائم ہوگی وہاں کے معاشرہ کا نقشہ کیا ہوگا۔ یہ الگ موضوع ہے جس کے متعلق میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ علامہ اقبالؒ نے بھی اس موضوع پر بہت کچھ کہا ہے۔ لیکن ان تمام تفاصیل کو انہوں نے جاوید نامہ میں' فلکِ مریخ پر مرغدین کے نام کے مثالی خطہ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ اور وہ یہ ہیں:-

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش
خوب روئے و نرم خوئے و سادہ پوش

خوش کلام، خوش رنگ، نرم طبع، سادہ پوش، تسخیرِ قوائے فطرت میں اتنی بلندیوں پر پہنچے ہوئے کہ اپنے کاروبار کیلئے تمام توانائی (ENERGY) سرچشمۂ حرارت (آفتاب) سے براہِ راست حاصل کرنے والے:-

فکرشان بے درد و سوزِ اکتساب
رازدانِ کیمیائے آفتاب

ہر کہ خواہد سیم و زر گیرد ز نور
چوں نمک گیریم ما از آبِ شور

وہاں علم و ہنر کا مقصد، نوعِ انسانی کی خدمت ہوگا نہ کہ حصولِ زر و سیم۔ سکوں کا اس زمین پر رواج ہی نہ ہوگا:-

خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر
کارہا را کس نمی سنجد بزر

کس ز دینار و درم آگاہ نیست
ایں بتاں را در حرمہا راہ نیست

نہ وہاں ایسی مشینیں ہوں گی جو بھوتوں کی طرح انسان کے سر پر سوار ہوں گی۔ نہ فیکٹریوں کی چمنیاں فضائے آسمانی کو دھوآں دھار بنا رہی ہوں گی۔ مشینیں خدمتگذار۔ دھوئیں کی جگہ آفتابی حرارت:-

بر طبیعت دیوِ ماشیں چیرہ نیست
آسمانہا از دخانہا تیرہ نیست

وہاں کا کسان نہایت مرفہ الحال اور خوش و خرم ہوگا۔ نہ زمیندار کی سلب و نہب (EXPLOITATION) اس کا خون چوسے گی نہ اس کی محنت کا ماحصل کوئی اور چھین کر لے جائے گا:-

سخت کوش دہقاں، چراغش روشن است — از نہابِ دہ خدایاں ایمن است
کشت و کارش بے نزاعِ آب جو است — حاصلش بے شرکتِ غیرے از وست

چونکہ وہاں سلب و نہب (EXPLOITATION) کا تصور ہی نہ ہوگا اس لئے باہمی مفاد کے تصادم (CLASH OF INTERESTS) کا بھی سوال پیدا نہ ہوگا اور جب مفاد کا تصادم نہ ہوگا تو پھر کشت و خون بھی نہ ہوگا۔ ہر طرف امن ہی امن ہوگا۔ اس لئے وہاں بے کار فوجیں (STANDING ARMIES) رکھنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی ؎

اندر آں عالم نہ لشکر نے قشوں — نے کسے روزی خورد از کشت و خوں

وہاں کے اہلِ قلم بھی پروپیگنڈے کی دروغ بافیوں میں مصروف نہ ہوں گے ؎

نے قلم در مغربش گیرد فروغ — از فنِ تحریر و تشہیرِ دروغ

نہ وہاں کوئی بے کار ہوگا نہ گداگر ؎

نے ببازاراں ز بے کاراں خروش — نے صدا ہائے گدایاں دردِ گوش

دو لفظوں میں یہ سمجھئے کہ نہ وہاں کوئی سائل ہوگا نہ محروم۔ نہ کوئی کسی کا آقا نہ کوئی غلام۔ نہ کوئی کسی کا حاکم نہ کوئی کسی کا محکوم ؎

کس دریں جا سائل و محروم نیست — عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

---

اس کے بعد حکیم مریخی نے بتایا کہ تمہارے ہاں معاشرہ میں جو اس قدر ناہمواریاں اور فساد انگیزیاں ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے اشیاء کو افراد کی ملکیت تصور کر رکھا ہے۔ ملکیت کا تصوّر، تمام فسادات کی جڑ ہے۔ یہاں ہر شے خدا کی ملکیت ہے اور انسانوں کے سپرد بطور امانت کی جاتی ہے ؎

اے کہ می گوئی متاعِ ما ز ماست — مردِ ناداں ایں ہمہ ملکِ خداست

زمین خدا کی ہے اور افراد اس کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ یہ قرآن کے حکم کی صریح مخالفت ہے ؎

ارضِ حق را ارضِ خود دانی بگو! — چیست شرحِ آیۂ لا تفسدوا

لہٰذا صحیح نظام یہ ہے کہ ہر شے "خدا کی ملکیت" میں دے دی جائے ؎

کس امانت را بکارِ خود ..... نبرد — اے خوش آں کو ملکِ حق با حق سپرد
ملکِ یزداں را بہ یزداں باز دہ — تا ز کارِ خویش بکشائی گرہ!

یہ تمام محتاجی اور غریبی، افلاس اور زبوں حالی اس لئے ہے کہ خدا کی ملکیت کو انسانوں نے اپنی ملکیت سمجھ رکھا ہے ؎

زیرِ گردوں فقر و مسکینی چراست — آنچہ از مولاست می گوئی زماست

جب تم اپنی نگاہ میں یہ تبدیلی پیدا کر لوگے تو تمہاری خارجی دنیا خود بخود بدل جائے گی ؎

نوعِ دیگر بیں، جہاں دیگر شود — ایں زمین و آسماں دیگر شود

یہ تھا اقبالؒ کے نزدیک اسلامی مملکت میں معاشرہ کا نقشہ اور اسلامی نظام کا ماحصل۔ یعنی ؎

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس — نکتۂ شرعِ مبیں، ایں است و بس

والسلام

---

# اوراقِ گم گشتہ

کوئی تین برس اُدھر کا ذکر ہے، مجلسِ ترقیٔ ادب، لاہور کی طرف سے ایک کتاب شائع ہوئی، جس کا عنوان تھا ـــــ اقبالؒ معاصرین کی نظر میں ـــــ کتاب کے مرتب تھے پروفیسر عبدالقادر عظیم صاحب (جو اب مرحوم ہو چکے ہیں) - اس میں ایک مقالہ بہ عنوان "متفاول اقبالؒ" پرویز صاحب کے قلم سے بھی شامل تھا۔ حوالہ صرف "۱۹۳۲ء" دیا گیا تھا۔ ایک دوست کی نگاہوں سے یہ مقالہ گزرا تو انہوں نے ہم سے کہا کہ مقامِ حیرت ہے کہ پرویز صاحب کا یہ مقالہ (جو غالباً علامہ اقبالؒ پر ان کی اوّلیں نگارش ہے) طلوعِ اسلام یا اس کی طرف سے شائع کردہ کسی کتاب میں درج نہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اس مقالہ (بلکہ پرویز صاحب کی اس قسم کی اور تحریروں) کو بھی طلوعِ اسلام کے صفحات میں محفوظ کر لینا چاہیئے کہ ان کا شمار نوادرات میں ہوتا ہے۔ ہم نے ان سے اتفاق کیا۔ چنانچہ یہ مقالہ پیشِ خدمتِ قارئین ہے۔

پس منظر اس کا یہ ہے کہ ستمبر، اکتوبر ۱۹۳۲ء میں، ماہنامہ نیرنگِ خیال (لاہور) نے اپنا خصوصی شمارہ، اقبال نمبر کے نام سے شائع کیا۔ (وہ غالباً کسی ماہنامہ کا پہلا اقبالؒ نمبر تھا۔) اور پرویز صاحب نے ان کے حسبِ فرمائش یہ مقالہ تحریر فرمایا۔ یہ آج سے پینتالیس سال پہلے کی بات ہے جب پرویز صاحب کی عمر ۲۸/۲۹ سال کی ہو گی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پرویز صاحب، تلاشِ حقیقت میں، تجسس و تحقیق کی مختلف وادیوں میں سرگرداں تھے، اور اگرچہ وہ اپنے دامن کو قدامت پرستی کی خاردار جھاڑیوں سے بڑی حد تک چھڑا چکے تھے لیکن ہنوز ان سے بالکلیہ باہر نہیں نکل پائے تھے۔ چنانچہ آپ کو ان کے اس مقالہ میں، اُس ماضی کے کئی ایک نقوش دکھائی دیں گے، جو بعد میں قرآن خالص پر آنے سے مٹ گئے۔ ہم نے مقالہ کے حواشی میں ان کی نشاندہی کر دی ہے۔

اس مقالہ کی اشاعت سے ہمارے پیشِ نظر جہاں یہ مقصد ہے کہ اس قسم کے نوادرات طلوعِ اسلام کے اوراق میں محفوظ ہو جائیں، وہاں یہ دکھانا بھی مطلوب ہے کہ ایک مفکر کی فکر کن ارتقائی مراحل سے گذرتی ہے۔ علامہ اقبالؒ پر جب ایک دفعہ یہ اعتراض کیا گیا کہ انہوں نے اپنے سابقہ خیالات میں تبدیلی کر لی ہے تو انہوں نے فرمایا کہ جامد تو پتھر ہوتا ہے۔ میں انسان ہوں اور انسانی فکر میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ قائدِاعظمؒ پر جب یہ اعتراض کیا گیا کہ آپ پہلے نیشنلسٹ تھے، اب دو قومی نظریہ کے داعی کیسے بن گئے، تو انہوں نے کہا کہ میں کبھی پرائمری میں بھی پڑھا

کرتا تھا اور پرویز صاحب تو اپنی ہر تصنیف کے آخر میں وضاحت سے لکھتے چلے آ رہے ہیں کہ میری فکر نہ حرفِ آخر ہے نہ سہو و خطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآنِ کریم کے سمجھنے کی انسانی کوشش ہے۔ اگر اس میں کوئی بات قرآنِ مجید کے خلاف نظر آئے تو میں اس پر مزید غور کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہوں اور اس کے غلط ثابت ہونے پر اصلاح کے لئے آمادہ۔ اس مقالہ کے مطالعہ کے وقت اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھئے اور پھر یہ دیکھئے کہ آج سے پینتالیس سال پہلے بھی، پیامِ اقبالؒ اور قرآنی حقائق پر انہیں بہ ہیئتِ مجموعی کس قدر عبور حاصل تھا۔

اب آپ وہ مقالہ ملاحظہ فرمائیے۔

---

# متفاولِ اقبالؒ[1]

**ترا چنانکہ توئی ہر کسے کجا داند**
**بقدرِ طاقتِ خود می کند استدراک**

عالمِ انسان ملائکہ سے اشرف ہیں یا نہیں۔ یہ امر تو علم الاخلاق میں کسی حد تک متنازعہ فیہ رہا ہے۔ لیکن اس میں تو کسی کو کلام نہیں کہ عالمِ خلق میں حضرتِ انسان سے زیادہ شرف و احتیاط کسی اور کے حصہ میں نہیں آیا۔ ایک طرف صحفِ مقدسہ اس کی تصدیق میں رطب اللسان ہیں۔ اور دوسری طرف دورِ جدیدہ کے انکشافات اس کے موید۔ انجیل بتاتی ہے کہ آدم کو خدا نے اپنی شکل پر پیدا کیا ہے۔[2] خود قرآنِ حکیم خلقتِ انسانی کو "احسنِ تقویم" سے تعبیر کرتا ہے۔ اور اس کی ممکناتِ زندگی کو لامحدود قرار دیتا ہوا فرماتا ہے۔ وَسَخَّرَ لَکُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا۔

---

[1] متفاول (OPTIMIST) متشائم (PESSIMIST)

[2] پرویز صاحب نے قرآن مجید پر مزید غور و فکر کے بعد، ان نظریات میں تصحیح کر لی ہے۔ خدا نے آدم کو (جس سے مراد آدمی ہے) مسجودِ ملائکہ قرار دیا ہے، اور انسان کے متعلق کہا ہے کہ اسے "اکثر مخلوق" پر فضیلت عطا کی ہے۔ (۱۷/۷۰) قرآنِ کریم اس کی بھی تصدیق نہیں کرتا کہ خدا نے آدم کو اپنی شکل پر پیدا کیا۔ یہ تصور غیر قرآنی ہے۔

کہ بستیوں اور بندیوں میں جو کچھ ہے سب حضرتِ انسان کے تابع فرمان ہے۔ ادھر ماہرینِ نظریۂ ارتقاء نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ موجوداتِ عالم کی زنجیر کی آخری کڑی حضرتِ انسان ہے۔ اور اس سے بڑھ کر اشرف و مکمل ہستی ہنوز صفحۂ ارض پر نمودار نہیں ہوئی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر ہمارے پاس یہ نظری شہادات نہ بھی موجود ہوتیں تو بھی انسانی قدرت و امکان کی داستانیں ہمیں مجبور کر دیتیں کہ اس کی خلافت و نیابتِ الٰہی پر آمنّا و صدقنا کہا جائے۔

لیکن طبائع و اخلاقِ انسانی کی بوقلمونی بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ ایک طرف تو اس کی ہمّت و حوصلہ کی وسعتوں کا یہ عالم، اور دوسری طرف۔ جب بعض ناگزیر اسباب و علل کے ماتحت اس کے ارادوں میں تزلزل اور عزائم میں فسخ شروع ہوتا ہے۔ تو یہ دون ہمّتی۔ یاس و قنوط۔ افسردگی و پژمردگی تعطّل و تفلّج کا جیسا نمونہ پیش کرتا ہے۔ بایدو شاید۔ پتہ نہیں سب سے پہلے وہ کونسا شکستہ خاطر و اندوہگیں انسان تھا جو حوادث و آلام سے مجبور ہو کر دل چھوڑ بیٹھا۔ اور اپنے ماحول، دنیا و مافیہا، بلکہ خود اپنی ذات سے تنگ آ گیا۔ اور وہ کونسے ناقابلِ برداشت مصائب و آلام تھے جن سے تنگ آ کر اس نے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ دنیا حزن و آلام، رنج و کرب، عقوبات، صعوبات، مشکلات و تکالیف کا گھر ہے۔ اور مسرّت اور انبساط و سرور کی کچھ حقیقت نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ متشائم نظریہ قرونِ اولیٰ ہی سے انسانی دماغوں پر کالی گھٹاؤں کی طرح چھا گیا تھا۔ حکمتِ یونان اپنے اوجِ کمال پر تھی کہ افلاطون کا فلسفہ لفیٔ حقیقت رائج ہو گیا۔ ادھر ہندوستان میں ویدوں کے زمانہ سے ہی اس کا سراغ مل جاتا ہے۔ آپ نشدھ کی تعلیم کے مطابق آتما حقیقی اور اس کے ماورا سب کچھ وہام یعنی لفی ہے۔ اور موجوداتِ عالم مایا یعنی سراب۔

اس کے بعد بدھ مت کا زمانہ آتا ہے اور اس نے تو یوں کہیئے کہ امیدوں کی چمکتی دنیا کا گویا جنازہ نکال کر رکھ دیا۔ مہاتما بدھ کی تعلیم کے مطابق حزن و ملال خلقتِ انسانی کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیئے گئے ہیں۔ دنیا میں انسان کا وجود بذاتِ خود ایک بلائے عظیم ہے۔ اس تعلیم کا بنیادی پتھر یہ ہے کہ "زندگی نام ہے خواہش و آرزو کا۔ اور آرزو سراپا درد و الم ہے۔ لہٰذا زندگی فی نفسہٖ درد و الم ہے۔ اور صرف ترکِ علائق، نفیٔ خودی اور تعطّلِ آرزو یعنی امیدوں کی فنا اور خواہشات کی موت سے آتما اس سکونِ ابدی اور راحتِ سرمدی کو حاصل کر سکتا ہے۔ جس کا نام نروان ہے"۔ دوسری طرف عیسائیت میں یہ مسئلہ کچھ اور بھی لچک لے کر ابھرا۔ ان کے نزدیک اس مجلسِ آب و گل میں انسان تشریف ہی اس لئے لاتا ہے کہ اپنے اوّلین ماں باپ (آدم و حوّا) کے گناہوں کی سزا بھگتے۔ لہٰذا جتنا اس جیل خانہ سے دور رہے اتنا ہی سکھ ہے کہ ؎

نہ رہے بانس نہ بجے بانسری

---

ھ آدمؑ کے خلیفۃ اللہ ہونے کا نظریہ بھی صحیح نہیں۔ پرویز صاحب نے اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے۔

فلاسفۂ یورپ میں (LIBNITZ) کے وقت تک پھر بھی ایک حد تک متفاؤل نظریۂ حیات کا چرچا تھا۔ ہیوم نے اس روش کا کچھ کانٹا بدلا۔ مکینتے اور سپنسر اثبات سے تشکیک پر اُترے اور شوپنہار نے تو بالکل بدقسمتی کا چولا پہن لیا۔ وہ "زندگی اور خواب کو ایک ہی کتاب کے دو ورق" گردانتا ہے۔ اس کے نزدیک "انسان ایک عیرفانی درد و کرب کا تختۂ مشق ہے۔ اور مسرت و انبساط کا جو سراب اسے نظر آتا ہے وہ محض اس لئے ہے کہ یہ مصائب جھیلنے کے لئے ارتباطِ جسم و جان قائم رکھ سکے۔" لیکن چونکہ یورپ نے ایسے فلسفیانہ نظریات کو عملی دنیا میں زیادہ دخل نہ دینے دیا۔ اس لئے یہ چیزیں ان کی مادی ترقی میں مانع نہ ہوئیں۔

---

اسلام دنیا میں آیا۔ اور امیدوں کی ایک دنیا اپنے ساتھ لایا۔ اس نے آتے ہی للکار کر کہا کہ:۔

لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳/۱۳۹)

مت گھبراؤ، بالکل خوف نہ کھاؤ۔ تم ہی سب سے بلند و برتر ہو۔ بس قوانینِ خداوندی کو ہاتھ سے نہ چھوڑو۔

اس نے موجوداتِ عالم اس کی فرمانبردار ٹھہرائیں۔ متاعِ دنیا اور مال و منال اس کے لئے باعثِ زینت و افتخار قرار دیئے۔ سرخروئی عقبیٰ کے ساتھ ساتھ دنیاوی فلاح و بہبود کی زندگی کو بھی ماحصلِ حیات گردانا۔ اور ایک مسلم کی زبان سے یہ دعا نکلوائی کہ:۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً

اس نے ایمان و عمل اور یکسر ایمان و عمل کو رازِ حیات بتایا۔ اور یاس و قنوط۔ نا امیدی اور عدم آرزو کو کفر سے تعبیر کیا۔ اور صاف صاف فرما دیا کہ: لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ۔ مصائب و آلام کی گھٹائیں چاروں طرف چھا رہی ہیں۔ مسلمان ۔۔۔۔۔۔ بے یار و مددگار نظر آتے ہیں۔ بظاہر دل ہلا دینے والے اسباب جمع ہیں۔ لیکن اسلام 'زندہ آرزوؤں کا مذہب اسلام' اس وقت پکار پکار کر کہتا ہے: لا تحزن ان اللہ معنا۔ مت گھبراؤ، اللہ تمہارے ساتھ ہے۔

اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ۔ وہ دیکھو نصرتِ خداوندی سامنے کھڑی ہے۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ: ہمت و استقلال سے کام لو، ہمت بھی کرو۔ دعائیں بھی مانگو۔ حوصلہ رکھو، تم دس ہو گے تو سو پر فتح پاؤ گے۔ سو ہو گے تو ہزار پر بھاری ہو گے۔ بشرطیکہ امید کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔

یہ قانونِ فطرت دنیا میں خدا کا آخری پیغام بن کر آیا۔ اور چند دنوں میں، صدیوں میں نہیں چند دنوں میں، اس نے سرزمینِ عرب کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ قیصر و کسریٰ کے خزانوں کی کنجیاں 'بوریا نشین' بادیہ پیما' اونٹ چرانے والے بدوؤں کے ہاتھوں میں دے دیں۔

---

لیکن افسوس! یہ تابناک و درخشندہ عہد کچھ زیادہ دیر نہ رہنے پایا تھا کہ فطرت کے یہ سیدھے سادے قوانین گرد و پیش کی فضا سے متاثر ہونے لگ گئے۔ شروع شروع میں شام و فلسطین کے کلیساؤں نے ان پر اپنا رنگ چڑھایا۔ پھر جب حکمتِ یونان عربی میں منتقل ہونی شروع ہوئی، فلسفۂ اشراقین نے اپنا اثر ڈالا، عجم میں زرتشتی آتشکدے ان اثرات کو جلا دینے کے لئے تیار تھے اور اس کے بعد جب ہندوستان میں پہنچے تو ویدانتیت نے ایسا "من تو شدم تو من شدی" کا منتر پھونکا کہ ایک دوسرے میں مدغم ہو کر یکسر "ہمہ اوست" ہو گئے۔ تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری۔ جہاں جہاں اور جب تک حکومت ہاتھ میں رہی اس کے اثرات زیادہ نہ ابھرے، لیکن جونہی حکومت کا سلسلہ ہاتھ سے چھوٹا ان کا رنگ زبانِ حال سے کہہ رہا تھا کہ ؎

بالیقین من نیم، و وہم و گمانم باقیست

میرے نزدیک تصوف تہذیبِ نفسِ انسانی اور قوائے ملکیہ کی جلا کے لئے ازبس ناگزیر ہے[1]۔ لیکن وہی تصوف جو "نانِ شعیر" سے، قوتِ حیدری پیدا کر دے جس سے اویس قرنیؓ کا سا عشق، بوذرؓ کا سا فقر، سلمانؓ کا سا صدق، صدیقؓ کا سا ایثار اور جنیدؒ کا سا استقلال پیدا ہو جائے۔ جو خوفِ غیر اللہ کو اس طرح قلبِ مومن سے محو کر دے کہ راجپوتانے کے بت کفرستان میں تنہا توحید کا نعرہ بلند کرنے میں باک نہ سمجھے۔ جو سرزمین دہلی کو جاں سپاری و سرفروشی کو امتحان گاہ بنا دے، جو یہ سبق سکھلا دے کہ پانی پت کے میدان میں مسلمان سپاہیوں کی قبروں کے پہلو بہ پہلو حضرت مخدوم جلال اور ترک شیرازی کے مقبرے بھی ہونے ضروری ہیں۔

ہاں تو عرض یہ کرنا تھا کہ ہندوستان میں پہنچ کر فلسفۂ ویدانت نے اسلامی تصوف پر اس قدر گہرا رنگ چڑھا دیا تھا۔ یہ کیوں ہوا، اس کا جواب مثنوی اسرارِ خودی کی ایک تمثیلی حکایت سے ملے گا۔ لکھا ہے کہ ایک جنگل میں بہت سی بھیڑیں رہتی تھیں۔ کچھ دنوں کے بعد وہاں کچھ شیر آ گئے اور ان بھیڑوں کا شکار کرنے لگے۔ ان میں سے ایک بھیڑ بڑی دانا اور ہوشیار تھی اس نے سوچا کہ بھیڑوں کو شیر بنانا تو مشکل ہے۔ آؤ ایک ایسی چال چلیں کہ شیر بھیڑوں کی خو بو اختیار کر لیں۔ وہ ایک مقدس صورت اختیار کر کے شیروں کے پاس گئی اور "ناثباتیٔ دنیا" نفی وجود، سرابِ ہستی کی خوش آئند تعلیم دینی شروع کی۔ رفتہ رفتہ شیر اس پندِ خواب آور سے اس درجہ متاثر ہو گئے کہ انہوں نے دینِ گوسفندی اختیار کر لیا، حتیٰ کہ ؎

شیر بیدار از فسونِ میش خفت
انحطاطِ خویش را تہذیب گفت

---

[1] اس زمانے میں پرویز صاحب ہنوز تصوف کی بھول بھلیاں سے نکل نہیں پائے تھے لیکن اس کے باوجود آپ دیکھئے کہ وہ اس وقت بھی کس قسم کے تصوف کے قائل تھے۔

کچھ گرد و پیش کا اثر جس کے متعلق (BLOOMFIELD) ایک جگہ لکھتا ہے "ارضِ ہند اپنی آب و ہوا فطری اثرات اور معاشرتی حالات کی بنا پر متشائم فلسفۂ حیات کی کافی وجوہ اپنے اندر رکھتی ہے" اس پر فلسفۂ ویدانت کا رنگ۔ نتیجہ یہ کہ اکبرؔ کے وقت تک اچھے خاصے ہمہ اوست کے رنگ میں رنگے گئے اور اگر سچ پوچھو تو عالمگیرؒ کے بعد جو سلطنت کو زوال ہوا تو اصولی طور پر سب سے پہلے شطحیاتِ دارشکوہؒ اس کے ذمہ دار ہیں۔

شاعری بقول میکالے چمکتی ہی دورِ تنزّل و انحطاط میں ہے۔ جہاں تگ و دوِ حیات، کشمکشِ روزگار، جہد للبقاء کا سوال درپیش ہوا، وہاں فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم ایام سے متشائم فلسفۂ حیات جذباتی شعرا کو ہمیشہ عزیز رہا ہے۔ ہومر کا یہ المیہ گیت کسے یاد نہیں:

دنیا میں جتنی چیزیں ہیں انسان سے زیادہ المناک کسی اور کی زندگی نہیں۔

اور سوفقلس کا یہ نوحہ کسے بھولا ہوا ہے:-

بہترین آرزو یہ ہے کہ دنیا میں انسان آئے ہی نہیں۔

اور اگر آچکا ہے تو پھر سب سے بہتر یہ ہے کہ:

انسان جہاں سے آیا ہے جتنی جلدی ہو سکے وہیں واپس لوٹنے کی کوشش کرے۔

عرب کے ولولہ خیز خون میں حرارت پیدا کرنے والے رجزیہ زمزمے جب عجمی دورِ تعیش و تنعم کی مجلسوں میں آئے تو یہاں دنیا ہی نرالی دیکھی۔ نتیجہ یہ کہ۔ ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

حرارت و اضطراب، اور سیمابیت کی جگہ کیف و خمار، آسودگی و تن آسانی نے لے لی۔ اس دور کی شاعری پر نظر ڈالئے تو صاف نظر آ جائے گا کہ کہاں یہ کہ:۔

اگر بچہ بکامِ من آید جواب    من و گرز و میدان و افراسیاب

اور کہاں یہ کہ:۔

حدیثِ مے و مطرب گو و رازِ دہر کمتر جو    کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

ہندوستان میں اوّل تو سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے ساتھ ساتھ ہی لیکن بالخصوص غدر کے بعد اردو شاعری پر یہ نشۂ یاس و قنوط کا چھا گیا اور اب خوب اچھی طرح چھا گیا۔ شعر کی انتہائی خوبی یہ قرار دی گئی کہ اس میں سوز و گداز ہو، افسردگی ہو، یاس ہو، موت ہو۔ بلکہ موت کے بعد بھی کوئی تڑپ، کوئی حرکت نہ ہو۔ کامل سکوت اور بے حسی ہو۔ غرضیکہ واہ واہ کی جگہ، ہائے ہائے ہو۔ محفل میں چاروں طرف ایک کہرام مچ رہا ہو۔ اور بزمِ مشاعرہ پر ماتم کدہ کا گمان گذرے۔ اس دور کی شاعری پر طائرانہ نظر ڈالنے سے واضح ہو جائے گا کہ جن شعرا کو اساتذۂ فن کے زمرہ میں اوّلین صف میں جگہ دی جاتی ہے، اُن کا طرۂ امتیاز یہی افسردگی و یاس کا فلسفہ ہے۔ کسی شاعر کا دیوان اٹھا

کر دیکھ لیجئے، یہی رنگ نظر آئے گا۔ دو چار شعر ملاحظہ ہوں ؎

اب تو یہ چاہتا ہوں کہ اے انتہائے غم! آئے مجھے ہنسی بھی تو میں رو دیا کروں

عالم کی فضا پوچھ محرومِ تمنا سے بیٹھا ہوا دنیا میں اُٹھ جائے جو دنیا سے

کیا ہنسے انسان اور کیا رو سکے جی ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے

میرے دم پر جو گذرتی ہے گذر جانے دو قصۂ غم نہ بڑھاؤ مجھے مر جانے دو

تمہید ہے خزاں کی یہ ہنگامۂ بہار اچھا ہے میرا نخلِ تمنا ہرا نہ ہو

جمال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ ہر قدم پر ہے گماں یاں رہ گیا واں رہ گیا

دلِ مایوس میں امید نے لی اس طرح کروٹ اُبھر کر کوئی سطحِ آب پر گویا حباب آیا

کیا کروں شرحِ خستہ جانی کی ہم نے مر مر کے زندگانی کی

صبا شکستہ پروں کی دعائیں لیتی جا جھکا دے اور ذرا شاخ آشیانے کی

فنا سے پہلے غمِ دل کی انتہا معلوم مگر یہ دل بھی مٹے گا کبھی یہ کیا معلوم

غم ایک ہی ایسا ہے جو دنیا کو بھلا دے غم کیا ہے یہ نعمت ہے مگر جس کو خدا دے

پوچھا اثرؔ سے میں نے جو دل کا معاملہ! اک آہ سرد کھینچ کے خاموش ہو گیا

مجبوری و بے بسی ملاحظہ ہو:۔

خدا عدو کو بھی یہ خوابِ بد نہ دکھلائے قفس کے سامنے جلتا تھا آشیاں اپنا

غرضیکہ کہاں تک لکھتے جائیے۔ معلوم ہوتا ہے ایک صفِ ماتم بچھ رہی ہے جس پر دنیا و مافیہا کی نوحہ خوانی

ہو رہی ہے۔ اور تو اور جو چیزیں کبھی حصولِ سرور و انبساط کی غرض سے اختراع کی گئی تھیں، ان سے بھی مقصود حزن و غم ہی لیا گیا۔ شراب تک کی بھی خواہش محض اس لئے رہ گئی کہ ایک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے۔ اور ہمارے اس "موروثی ذوقِ ماتم کدہ" کا اندازہ آج بھی اس سے لگ سکتا ہے کہ موسیقی جیسی طرب انگیز اور گرما دینے والی چیز بھی اس وقت تک محفوظ نہیں کر سکتی جب تک اس میں نغمہ ہائے جانگداز اور "سوز" کی مسرتیں نہ ہوں۔

غرضیکہ افسردگی و غمزدگی کا یہ عالم مسلمانانِ ہند پر چھایا ہوا تھا۔ اور لطف یہ کہ اسس کا نام "تہذیب و اخلاق" رکھ چھوڑا تھا۔ قاعدہ ہے کہ انحطاط و زوال کے وقت خدا کے بندے پیدا ہوتے ہیں اور اُمتِ مرحومہ میں تو ایسے ایسے صاحبانِ فکر و بصیرت پیدا ہوتے ہیں جو بنی اسرائیل کے انبیائے کرامؑ کے سے کام کر کے دکھاتے ہیں (حدیثؐ شریف) چنانچہ شعراء میں حالیؔ مرحوم نے اس کا احساس کیا۔ قوم پر بڑی لے دے کی۔ ہر چند دل میں بڑا درد تھا۔ لیکن صدیوں کے نشہ کو چند "طعنوں" سے اتارنا مشکل تھا۔ اکبرؔ مرحوم بھی جب دل کی ٹیسیں سے مجبور ہوئے تو مریض کو ہوش میں لانے کے لئے کچھ کہہ دیئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ خوب دیئے۔ اور ہنسا ہنسا کر، گدگدا گدگدا کر ایسی ایسی پتے کی کہہ گئے کہ جی تن لاگے سو تن جانے۔ لیکن مرض کی کہنگی اور مریض کی ضد سے وہاں بھی یاس کا پہلو غالب رہا۔

---

لیکن قدرتِ کاملہ نے "بانگِ درا" کی خدمت کسی اور کے حصہ میں رکھی تھی۔ وقت آیا اور وہ ہستی پنجاب کے ایک اقبالؒ کے نام سے منصۂ شہود پر جلوہ فگن ہوئی۔ اس کی چشمِ حقیقت بیں نے واقعات کو چھوڑ کر ان کے علل و اسباب پر غور کیا۔ اور اس رموز شناسِ فطرت نے خوب محسوس کیا کہ فقدانِ عمل، بےحسی اور مردہ دلی کا سبب یہ ہے کہ سینوں میں دل اور دلوں میں آرزوئیں اور امنگیں، جوشش و ولولے پیدا کرنے والی حرارت موجود نہیں، آتش داں ہیں۔ لیکن افسردہ اور ٹھٹھرے ہوئے۔ اور علّتِ مرض یہ ہے کہ قوم اپنی حقیقت سے بےخبر ہو چکی ہے۔ افرادِ ملّت کا نظریۂ حیات متشائم ہو چکا ہے۔ لہٰذا سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ انہیں ان کی حقیقت سے آگاہ کیا جائے۔ انہیں ممکنات، زندگی کی وسعتوں سے روشناس کرایا جائے۔ اور مثنوی کے تمثیلی شیر کی طرح جو ایک عرصہ تک بھیڑوں کے گلہ میں پرورش پا کر اپنے آپ کو بھیڑ ہی شمار کرنے لگا تھا، کسی آئینہ میں اسے اس کے اصل خط و خال سے واقف کرا دیا جائے——ایک حقیقت بیں نبّاض کی طرح اس نے علّتِ مرض دریافت کی۔ اور مہربان معالج کی طرح اس کے لئے نسخے تجویز کئے اور ہرچند مرض مزمن اور مریض ضدی۔ اور ضدی بھی ایسا کہ خود درد کو دوا سمجھنے لگ گیا تھا لیکن اس کی پیشانی پر شکن تک نہیں آیا۔ اس نے طبائع کی کمزوریوں کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ بلکہ ان کے

---

ط۔ اس حدیث کی صحت بھی مشکوک ہے۔

حالِ زبوں پہ رحم کھایا اور مشفقانہ طور پر گرے ہوئے کو اٹھایا اور اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

سب سے پہلے ہم یہی دیکھتے ہیں کہ اس نے زندگی کی درخشندہ و تابناک تصویر، جس پر صدیوں سے یاس و مردہ دلی کا گرد و غبار پڑ رہا تھا، کس طرح اپنے اصل خط و خال میں پیش کی۔ ہر چند علامہ مرحوم کا سارا کلام انہیں رموز و حقائق سے لبریز ہے۔ لیکن مثال کے طور پر چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

فرماتے ہیں:-

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا　　دانہ تو کھیتی بھی تو باراں بھی تو حاصل بھی تو

---

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو　　قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ　　تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو　　دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے

---

بے خبر تو جوہرِ آئینۂ ایام ہے　　تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

اور وسعت ملاحظہ فرمائیں:-

وہ مشتِ خاک ہوں فیضِ پریشانی سے صحرا ہوں　　نہ پوچھو میری وسعت کو زمیں سے آسماں تک ہے

شبِ معراج سے یہ سبق اخذ فرماتے ہیں کہ:-

وہ یک گام ہے ہمت کے لئے عرشِ بریں　　کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

اس لئے "وسعتِ پرواز" کو یہ مادیات تک ہی محدود نہیں کر دیتے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔

ارشاد ہے:-

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا　　نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

دامِ تسخیر کی وسعت اور ملاحظہ فرمائیے:-

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے　　یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

وہ "حیاتِ جاوداں" کو زندگی کی چار دیواری تک محصور نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک:-

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں　　ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

جب حضرتِ انسان کی ممکناتِ زندگی کی یہ وسعتیں ہوں، تو اسے کیوں نہ یہ درسِ حیات دیا جائے کہ:-

اے ز آدابِ امانت بے خبر　　از دو عالم خویش را بہتر شمر
تا کجا خود را شماری ماء و طیں　　از گِلِ خود شعلۂ طور آفریں

یاد رکھئے:-

ناتواں خود را اگر رہرو شمرد
نقدِ جانِ خویش با رہزن سپرد

اور یہ کیوں ہے؟ اس لئے کہ :-

ولے این راز را کس می نداند    ضمیرِ خاک و تخم بے گمان است

انتہا یہ ہے کہ :-

قدم در جستجوئے آدمے زن    خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

اس سے زیادہ اور کیا قیمت ہو سکتی ہے کہ خدا ہم در تلاش آدمے ہست۔ اللہ اکبر! یہ قدر و قیمت!

ہاں! اور چلتے چلتے ذرا اس معرکۃ الآرا "زندہ و پائندہ" نظم کے دو چار شعر بھی سُن لیجئے۔ جس کا عنوان ہی اس پیامبرِ حیات نے "زندگی" رکھا ہے۔ دیکھئے اور غور فرمائیے کہ کیا یہ ہمارا ہی ذکر ہو رہا ہے۔ زندگی کی بقا ملاحظہ فرمائیے :-

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی    ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ    جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی
اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے    سرِّ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے    گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

پھر اس کے اثرات ملاحظہ فرمائیے :-

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار    اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار    تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے

ممکناتِ زندگی کے ساتھ ساتھ متاعِ دنیا کے تمتع اور تسخیرِ خزائنِ نظامِ عالم کا درس بھی ضروری تھا۔ کیونکہ تمام فلسفۂ حیات نے متاعِ دنیا کو حرام سمجھ رکھا تھا۔ فرماتے ہیں :-

اے کہ از تاثیرِ افیوں خفتۂ    عالمِ اسباب را دوں گفتۂ
خیز و واکن دیدۂ مخمور را    دوں مخواں ایں عالمِ مجبور را
حق جہاں را قسمتِ نیکاں شمرد    جلوہ اش با دیدۂ مومن سپرد
نائبِ حق در جہاں آدم شود    بر عناصر حکمِ او محکم شود
وسعتِ رنگیں کن زندانِ کوہسار    جوشتے آب گوہر از دریا بیار
جستجو را محکم از تدبیر کن    انفس و آفاق را تسخیر کن
غنچہ از خود چیدن تعمیر کن    شبنمی؟ خورشید را تسخیر کن

یعنی عناصرِ عالم کے سامنے سر نیہوڑا کر، ہاتھ باندھ کر اطاعت کے لئے کھڑا نہ ہو جا۔ بلکہ ان سے خدمت لے۔ انہیں تابعِ فرمان بنا اور متاعِ دنیا سے پورا پورا فائدہ اٹھا۔

---

حقیقت سے آگاہی کا لازمی نتیجہ تھا کہ قوم کو اپنی بے حسی اور جمود و سکوت کا احساس پیدا ہوتا۔ چنانچہ جب دیکھا کہ قلبِ ملت میں خوابیدہ حسیات کی بیداری کی علامات ظاہر ہو رہی ہیں۔ عروقِ مردہ میں

سوزِ زندگی کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں، تو تخلیقِ آرزو (یا کم از کم تجدیدِ آرزو) کی ضرورت پڑی۔ کیونکہ جب ایک طرف متاعِ حیات کی قدر و قیمت اور دوسری طرف اپنی قوتِ بازو کا احساس پیدا ہو گیا تو جلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کے لئے آرزوؤں کا پیدا ہونا اس کا لازمی نتیجہ تھا۔ لہٰذا آرزو کی اہمیت و مختلف پیرایوں میں واضح کی گئی اور میں کہوں گا کہ یہی چیز علامہ ممدوح کا حقیقی پیغام ہے۔ پہلی منزل کو اس کا مقدمہ سمجھنا چاہیئے اور قوتِ عمل کو اس کا نتیجہ۔ یہی وہ جوہر تھا جس کے فقدان سے قوم پر مردنی اور بے حسی کی گھٹائیں چھا رہی تھیں اور اس کی تخلیق یا تجدید اس مرض کا علاج تھا۔ اب ملاحظہ فرمائیے کہ کس جوش اور ولولے سے امیدوں کی بستی از سرِ نو تعمیر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سب سے پہلے للکار کر یہ پیغام سنایا کہ:۔

مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار — ہر زمان پیشِ نظر لایخلف المیعاد دار

دیکھئے اس ایک شعر کے اندر کس قدر سربستہ رازِ حیات پوشیدہ ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ سارے فلسفۂ حیات کا نچوڑ اس پیغام کے اندر موجود ہے۔ آرزو سے خالی دل کی کچھ قدر و قیمت ان کے نزدیک نہیں ہے۔ فرماتے ہیں:۔

اگر ز رمزِ حیات آگہی مجوئے مگیر — دلے کہ از خلشِ خارِ آرزو پاک است

مثنوی اسرار و رموز میں جس میں علامہ ممدوح کا حقیقی معنوں میں مکمل پیغامِ حیات محفوظ ہے اور اس کے بعد کا کلام اسی پیغام کی تفسیر و تشریح۔ مسئلہ آرزو پر بڑی شرح و بسط سے بحث کی گئی ہے اور مختلف انداز سے اس کی اہمیت پر نظر ڈالا گیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

زندگی در جستجو پوشیدہ است — اصل او در آرزو پوشیدہ است
آرزو را در دلِ خود زندہ دار — تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار
آرزو جانِ جہانِ رنگ و بوست — فطرتِ ہر شے امینِ آرزوست
از تمنا رقصِ دل در سینہ ہا — سینہ ہا از تابِ او آئینہ ہا
طاقتِ پرواز بخشد خاک را — خضر باشد موسیٰ ادراک را
دل ز سوزِ آرزو گیرد حیات — غیرِ حق میرد چو او گیرد ثبات
چوں ز تخلیقِ تمنا باز ماند — شہپرش بشکست و از پرواز ماند
آرزو ہنگامہ آرائے خودی — موجِ بیتابے ز دریائے خودی
آرزو صیدِ مقاصد را کمند — دفترِ افعال را شیرازہ بند
زندہ را نفیِ تمنا مردہ کرد — شعلہ را نقصانِ سوز افسردہ کرد

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

دوسری جگہ فرماتے ہیں :-

گرم خون انساں ز داغ آرزو — آتش این خاک از چراغ آرزو
از تمنا مے بجام آمد حیات — گرم خیز و تیز گام آمد حیات
زندگی مضمون تسخیر است و بس — آرزو افسون تسخیر است و بس
زندگی صید افگن و دام آرزو — حسن را از عشق پیغام آرزو

ایک جگہ یاس و حزن و خوف کو ام الخبائث و قاطع حیات قرار دیتے ہوئے رقمطراز ہیں :-

مرگ را ساماں ز قطع آرزوست — زندگانی محکم از لاتقنطوست
تا امید از آرزوئے پیہم است — ناامیدی زندگانی را سم است
زندگی را یاس خواب آور بود — این دلیل سستی عنصر بود
از دمش میرد قوائے زندگی — خشک گردد چشمہ ہائے زندگی

یاس و ناامیدی فی الحقیقت ان کے پاس تک نہیں پھٹکتی۔ سخت سے سخت مصیبت میں بھی سر رشتۂ امید ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیتے۔ فرماتے ہیں :-

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے — ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے

اور :-

یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار — فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوش کارزار

ریاضِ ملت پر خزاں مسلط ہو چکی ہے۔ بادِ سموم کے جھونکوں نے ہرے بھرے درختوں کو خشک کر دیا ہے۔ برگ و گل مرجھا مرجھا کر گر پڑے ہیں۔ ایک آدھ پتا کہیں کہیں مثل چہرۂ مدقوق زرد نظر آتا ہے۔ یاس و قنوط کے اس اندوہناک سماں میں کیسے امید ہو سکتی ہے کہ یہ اجڑا چمن پھر بھی آباد ہو گا۔ لیکن ہمارا امیدوں کا شہزادہ ہے کہ اب بھی متفائم نظریہ کو پاس تک نہیں آنے دیتا اور چپکے سے آکر یہ درسِ حیات دیتا ہے کہ :-

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ — پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

اس مضمون کو مثنوی میں اس طرح بیان فرمایا ہے :-

برگ سبزے کز نہال خویش ریخت — از بہاراں تار امیدش گسیخت
در خزاں اے بے نصیب از برگ و بار — از شجر مگسل بامید بہار

امید — امید — اور ہر حالت میں امید — کبھی مایوسی نہیں۔ کبھی افسردگی نہیں۔ پھر اس گلچینی بہار میں وسعتِ داماں ملاحظہ فرمائیے :-

نہ ہو قناعت شعار گلچیں اسی سے قائم ہے شان تیری — وفور گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا

اسی مضمون کو دوسری جگہ اس طرح بیان کیا ہے :-

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا — ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی ہے

امید و آرزو کا ایسا متفاول فلسفۂ حیات کم ہی کسی کے ہاں ملے گا۔

اب جبکہ آرزوئیں پیدا ہو گئیں۔ اُمیدیں وابستہ ہو گئیں۔ نا اُمیدی کا چھلاوا غائب ہو گیا۔ حزن و ملال کا بوجھ دل سے ہلکا ہوا، تو حصولِ مدعا کے لئے فطرتی طور پر دل میں ایک تڑپ پیدا ہوئی۔ یہاں پہنچ کر اب یہ بتانے کی ضرورت تھی کہ یاد رکھو کامیابی و کامرانی فتح و نصرت کا راز عمل اور قوت میں پوشیدہ ہے اور آرزو بغیر عمل کے بالکل مہمل چیز ہے۔ چنانچہ یہ رازِ سربستہ کھول کر سامنے رکھ دیا کہ :-

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

مثنوی میں فرماتے ہیں :-

در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات
لذتِ تخلیق قانونِ حیات

قوت کی اہمیت کے متعلق ذیل کے دو مصرعوں میں جن حقائق کا انکشاف کیا گیا ہے۔ بڑی بڑی ضخیم کتابوں میں بھی یہ مضمون سما نہ سکتا تھا۔ ملاحظہ فرمایئے :-

زندگی کشت است و حاصل قوت است
شرحِ رمزِ حق و باطل قوت است

یہ وہ معارف و حقائق ہیں جو کسی دلیل کے محتاج نہیں۔ ملل و اقوامِ عالم کی تاریخ۔ اور خود دورِ حاضرہ کے روزانہ مشاہدات اس کی زندہ مثالیں ہیں۔

جب اپنی حقیقت سے آگہی۔ دل میں آرزو۔ اور جوشِ عمل اور بازو میں قوت پیدا ہو گئی تو ایک ایسا معیارِ حیات مقرر کر دیا جس سے زندگی کی خامیاں دور ہو کر اس میں پختگی پیدا ہو جائے اور زندگی اس درجہ محکم و استوار ہو جائے کہ بڑے سے بڑا خطرہ اور مہیب سے مہیب حادثہ اس میں تزلزل نہ پیدا کر سکے۔ اس مقام پر قرآنِ حکیم نے فرمایا کہ: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ...... اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ کہ دنیا میں تمہارے اوپر مختلف قسم کی آزمائشیں آئیں گی۔ منجملہ ان کے خوف و حزن۔ بھوک، پیاس۔ نقص مال و جان وغیرہ ہوں گی۔ پس فتح و کامرانی کی خوشخبری ان کے لئے ہے کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو ہمت و استقلال سے کام لیتے ہیں اور بے باکانہ کہہ دیتے ہیں کہ ہماری زندگی اور موت، رنج و غم، سود و زیاں جو کچھ بھی ہے، سب اللہ کے لئے ہے اور ہم سب کو اُسی کی طرف پلٹنا ہے۔

چنانچہ ایک ایسی ہی زندگی کا نقشہ علامہ ممدوح نے پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں :-

بہ کیشِ زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است
سفر بکعبہ نکردم کہ راہ بے خطر است

دوسری جگہ اس کو یوں بیان فرماتے ہیں :-

مرا ز حادثہ این نکتہ آموختند
ز منزل جادۂ پیچیدہ خوشتر

بےباک زندگی کے متعلق فرماتے ہیں :-

دلِ بے باک را ضرغام رنگ است
دلِ ترسندہ را آہو پلنگ است
اگر بیمے نداری بحر صحرا است
اگر ترسی بہر موجش نہنگ است

پوچھا گیا کہ رازِ حیات کس چیز میں ہے۔ جواب سن لیجئے :-

در نیستش گفت اے یارِ خردمند
اگر خواہی حیات اندر خطر زی

خطر تابِ و تواں را امتحان است　　　عیارِ ممکنات جسم و جان است

لالۂ طور میں فرماتے ہیں :-

سکندر با خضر خوش نکتۂ گفت　　　شریکِ سوز و سازِ بحر و بر شو
تو ایں جنگ از کنارِ عرصہ بینی　　　بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو

دوسری جگہ اس کو یوں بیان فرماتے ہیں :-

بدریا غلط و با موجش در آویز　　　حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

آپ نے غالباً یہ تعلیم بھی سنی ہوگی :-

بدریا در منافع بے شمار است　　　وگر خواہی سلامت بر کنار است

اب ذرا اوپر کے شعر کو دوبارہ ملاحظہ فرمائیے :-

خیال ایں کن تن آسانی درا کجا داستان

دوسروں کے آسرے پر زندگی کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں :-

مرا از شکستن چنیں عار ناید　　　کہ از دیگراں خواستن مومیائی

اسی طرح :-　نفس دارد و لیکن جاں ندارد　　　کسے کو بر مرادِ دیگراں زیست

یہ شعر تو یقیناً آج ہر مسجد کے محراب پر کندہ کرا دینا چاہئے۔ اور اس کے قطعات ہر مکان اور ہر دکان میں آویزاں ہونے چاہئیں :-

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی!
چو خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است

اللہ اکبر۔ کس قدر "زندگی" ہے اس پیغام کے اندر۔

پھر جب زندگی اس قالب میں ڈھل جائے، قوم کی قوم اس رنگ میں رنگی جائے تو امیدوں کی چمکتی دنیا کا تخیل کس حسین انداز کا نظارہ پیش کرتا ہے۔ سنئے :-

فروغِ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے　　　زمیں از کوکبِ تقدیرِ ما گردوں شود روزے

---

یہ ہے مختصر پیامِ حیات، جو اس عظیم اور حقیقت شناس فطرت شاعر کا [illegible] (اقبال مرحوم) کا لازوال کارنامہ ہے۔ اور اگر یہ صحیح ہے کہ قوم کی حالت بدلنے کیلئے پہلے افراد کی ذہنیت بدلنی ضروری ہوتی ہے تو بلا خوفِ تردید کہا جا سکے گا کہ آج تعلیم یافتہ مسلمانوں میں اگر کچھ زندگی کے آثار نظر آ رہے ہیں، تو یہ بڑی حد تک علامہ اقبالؒ کے پیامِ حیات بخش کے رہینِ منت ہیں۔ آج اگر ان اثرات کی ابتداء ہے، تو کل یہ شجرِ طیبہ اصلھا ثابت و فرعھا فی السماء کا مصداق بن کر رہے گا۔ اور اسلام کی حیاتِ جدیدہ میں علامہ مرحوم کا نام درخشندہ ستاروں کی طرح تابناک رہے گا۔

ایسے کاش مُردوں کی یادگاریں قائم کرنے والی قوم اپنے زندہ افراد کی قدر کرنا بھی سیکھے۔

[illegible] یہ فراموشی ادا کردم

---

| | |
|---|---|
| محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن | **لاہور** میں ہر اتوار ۸ بجے صبح (فون ۸۰۶۰۰)<br>۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن) |
| **کمالیہ** میں ہر جمعہ بوقت ۳ بجے سہ پہر (بذریعہ ٹیپ)<br>(لائلپور) دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بالمقابل چکی) اندرون بازار | **کوئٹہ** میں ہر جمعہ بعد نمازِ مغرب کیپٹن غلام حیدر خاں کے مکان<br>(نمبر ۱۳/۵-۱ وارڈ ۱) واقع عقب گلی گرلز ہائی اسکول (بذریعہ ٹیپ) |
| **ملتان** میں ہر جمعہ بعد نمازِ مغرب (بذریعہ ٹیپ)<br>(فون ۷۲۸۷۱) دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ۔ | **کراچی** میں ہر اتوار بوقت ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ)<br>(فون ۶۱۰۳۶۸) دفتر بزمِ طلوعِ اسلام - دار القائم -<br>۲۰-۱/ڈی - ناظم آباد ۲۔ |
| **جام پور** میں ہر جمعہ بعد نمازِ عشاء (بذریعہ ٹیپ)<br>(ڈیرہ غازیخاں) بلوچ جنرل اسٹورز - اڈہ روڈ | **لائلپور** میں ہر جمعہ بوقت ۸ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)<br>(فون ۲۲۹۰۳) ۵۔ کوتوالی روڈ حیات سرجری کلینک |
| **گجرات** میں ہر جمعہ بعد نمازِ جمعہ نیز بروز اتوار ۵ بجے شام<br>بمقام ۱۲/۱/بی۔ بھمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ) | **راولپنڈی** میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)<br>جی - ۱۲۶ لیاقت روڈ۔ |
| **جلالپور جٹاں** میں ہر جمعہ بعد نمازِ جمعہ (بذریعہ ٹیپ)<br>(گجرات) دفتر بزمِ طلوعِ اسلام زرگراں کالونی | **کوہاٹ** میں ہر جمعہ بوقت ۴ بجے سہ پہر (بذریعہ ٹیپ)<br>مکان نمبر ۹/۱۲ [illegible] اسٹار روڈ (نزد گرین ہوٹل) |


کیا تنہا عقلِ انسانی وحی کی مدد کے بغیر زندگی کے بنیادی مسائل کا حل دریافت کر سکتی ہے؟
اس اہم اور بنیادی سوال کا جواب افلاطون سے لے کر عہدِ حاضر تک کے مفکرین، محققین، علمائے اخلاقیات، عمرانیات، معاشیات، سیاست اور ماہرینِ علم النفس کی تحقیق کی رُو سے، محترم پرویز صاحب کی کتاب۔

# اِنسان نے کیا سوچا؟

میں مل جائے گا، جو آپ کو سینکڑوں کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز کر دے گی اور آپ کے سامنے یہ حقیقت بھی واشگاف ہو گی کہ عقلِ انسانی کو وحی کی ضرورت کیوں ہے۔ بہترین لکھائی چھپائی، خوبصورت ٹائپ، سفید کاغذ
قیمت مجلد -/۲۰ روپے۔ (علاوہ محصول ڈاک) ملنے کا پتہ:-

**(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبۂ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور**

# بزمِ مذاکرہ (طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۶ء) ..... (قسط سوم)

(بزمِ مذاکرہ کی قسط اوّل و دوم جنوری و مارچ ۷۷ء کے شماروں میں شائع ہو چکی ہیں۔ اب قسط سوم پیشِ خدمت ہے)

## ۶۔ ظہیر احمد۔

سب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے  زوالِ بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

صدرِ گرامی قدر، محترم باباجی و معزز سامعین!

آج بزمِ مذاکرہ میں موضوعِ سخن مفکرِ اسلام، حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ کا ایک حقیقت کشا شعر ہے۔ یہ اقبال علیہ الرحمۃ کا ایک شعر نہیں، بلکہ کاروانِ انسانیت کی راہ نمائی کے لئے اہم اصول اور ایک مردِ مومن کی جرأتوں، کاوشوں اور اس کی جگر پاشیوں کے لئے ایک جذبۂ محرکہ ہے۔

صاحب صدر! اس سے قبل کہ میں ایمان باللہ کی بنیادوں پر استوار ہونے والی حق و صداقت کی علمبردار جماعتِ مومنین کے متعلق کچھ عرض کروں۔ بطورِ تقابل تمام نہاد علمبردارانِ مذہب و سیاست اور انسانوں کے خود ساختہ مذاہب و فرق کے اجارہ داروں کے مادی سہاروں کے متعلق کچھ کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

محض مفادِ عاجلہ چاہنے والی سیاسی پارٹیاں ہوں یا اَرْبَابٌ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ۔ احبار و رہبان کے نام نہاد مذہبی سلسلے اور تنظیمیں ہوں۔ وہ مال و دولت کے بغیر کبھی قائم نہیں رہ سکتیں۔ ان کے سامنے کوئی خارجی ضابطۂ حیات نہیں ہوتا اور اس وجہ سے حیاتِ اخروی، تسلسلِ حیات اور قانونِ مکافاتِ عمل پر صحیح معنوں میں ان کا ایمان نہیں ہوتا۔ اس لئے اپنی اپنی جماعتوں کو چلانے کے لئے لامحالہ انہیں مادی سہاروں کا ہی محتاج ہونا پڑتا ہے، اس کے لئے انہیں مختلف پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔

چندے، قربانی کی کھالیں، صدقاتِ فطر، نذرانے اور اس قسم کے مقدس ناموں سے وہ عوام کے مال و دولت کو باطل طریقوں سے کھا جاتے ہیں۔ اسی حقیقت کو قرآن کریم نے اپنے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَیَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔

اے جماعتِ مومنین! علمائے شریعت اور پیرانِ طریقت کی اکثریت کا یہ عالم ہے کہ عوام کے مال، باطل طریقہ سے ہڑپ کر جاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے باز رکھتے ہیں۔

اور اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

نذرانہ نہیں سود ہے پیرانِ حرم کا  ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن

صدرِ ذی وقار۔ کوئی فرعون اپنی فرعونیت کو بزورِ شمشیر مسلط نہیں رکھ سکتا۔ تاوقتیکہ ملکِ مصر

کی نہریں اور سرسبز و شاداب کھیت اس کے تصرف میں نہ ہوں۔ کوئی انسان مزاج شناسِ عوام اپنی دسیسہ کاریوں سے فضائے ملک و ملت کو مسموم اور ردائے ملک و ملت کو پارہ پارہ نہیں کر سکتا جب تک کہ یہ "شیخِ حرم" گلیم بوذر و دلقِ اویس و زہرہ کو چرا کر نہ بیچ کھائے۔ غرضیکہ سرمایہ دارانہ جماعتیں ہوں یا فرقے، ان کی قیصری عوام کے خراج کی گداگر ہوتی ہے۔

لیکن صدرِ محترم۔ اس جہانِ رنگ و بو میں ان مذکورہ بالا مادی اغراض و مقاصد رکھنے والی تحاریک و تنظیم کے برعکس، وحی کی بنیادوں پر استوار ہونے والی ایک جماعت بھی ہوتی ہے جو ان مادی سہاروں پر اعتماد کئے بغیر، تعداد کی قلت کے باوجود، معرکۂ حیات میں سرگرمِ عمل ہوتی ہے۔ اس جماعتِ حقہ کے افراد کھجوریں کھا کر اور مستوی پی کر باطل کی قوتوں سے برسرِ پیکار ہوتے ہیں۔

اور یہ قرآن مجید کے اصول کے مطابق ہے۔

كَمْ مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ (۲/۲۴۹)

خدا کے قانون میں یہ بھی ہے کہ تعداد کی کمی، سیرت و کردار کی قوت سے پوری ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس اصول کے مطابق، کئی واقعات ایسے سامنے آتے ہیں، جن میں کم تعداد کے لوگ، گروہ کثیر پر غالب آ جاتے ہیں۔ اصل چیز استقلال و استقامت ہے۔ جو حق پر ثابت قدم رہے، خدا کے قانون کی تائید اس کے شاملِ حال رہتی ہے۔

صاحبِ صدر! اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ زوالِ بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں۔ میں اس میں اتنا اضافہ کرنا چاہوں گا کہ زوالِ بندۂ مومن کا باز زری سے ہے۔

زوالِ بندۂ مومن تو ایک طرف، آج آپ دنیا میں جو زوالِ آدمیت و انسانیت دیکھ رہے ہیں اس کا بنیادی سبب کثرتِ اموال و دولت ہی ہے۔ بڑے بڑے سرمایہ دار و زمیندار، مال و دولت سے معمور ممالک و اقوام، دراصل زوالِ انسانیت اور عزت و افلاسِ عوام کا سبب ہیں۔ میں نے جو مصرعۂ اقبالؒ میں (یوں کہئے کہ) اضافہ کیا ہے تو اپنی طرف سے نہیں بلکہ خود قرآنِ کریم کے احکام و قصص اس حقیقتِ نفس الامری پر شاہد ہیں۔

قرآنِ کریم نے تذکرۂ فرعون کے ساتھ، قارون کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کے بارے میں بتلایا کہ:۔

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ ..... (۲۸/۷۶)

قارون (فرعون کی طرح غیر قوم کا نہیں بلکہ وہ) قومِ موسےٰ کا ہی فرد تھا۔ یعنی کثرتِ اموال و دولت جسے میں نے بازری کہہ کر پکارا ہے میں حالت یہ ہو جاتی ہے کہ اس میں کوئی باہر سے آ کر قوم کا خون نہیں چوستا، خود قوم کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو لوٹتا ہے۔ اور صرف اتنا ہی نہیں ہوتا بلکہ، سرمایہ داروں کی عیش سامانیوں اور تن آسانیوں کو دیکھ کر دوسرے

لوگوں کے دل میں بھی ان جیسا بن جانے کی ہوس پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن حمید کہتا ہے کہ۔

قَالَ الَّذِينَ يُرِيدُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَا أُوتِيَ قَارُونُ إِنَّهُ لَذُو حَظٍّ عَظِيمٍ (۲۸/۷۹)

جن لوگوں کے پیشِ نظر زندگی کی عیش سامانیاں تھیں وہ یہ کہتے کہ اے کاش! جو کچھ قارون کو ملا ہے، وہ ہمیں بھی مل جاتا۔ یہ بڑا ہی خوش نصیب ہے۔

یہ حالت جاری رہی اور اس کے بعد ہوا یہ کہ:۔

فَخَسَفْنَا بِهِ وَبِدَارِهِ الْأَرْضَ فَمَا كَانَ لَهُ مِنْ فِئَةٍ يَنْصُرُونَهُ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِينَ۔ (۲۸/۸۱)

ہم نے اُسے اور اُس کے مال و متاع سے بھرے ہوئے گھر کو تباہ کیا اور اس وقت کوئی جماعت، قانونِ خداوندی کے مقابلہ میں اس کی مدد نہ کر سکی اور نہ ہی اُس سے خود ایسا ہو سکا کہ وہ اس تباہی سے بچ نکلتا۔

یہ تو ایک قارون اور اس کے ایک گھر ہی کی مثال تھی۔ جہاں کہیں بھی بالدری ہو اور اُسے قوانین خداوندی کے مطابق استعمال نہ کیا جائے، نتیجہ یہی نکلتا ہے۔

قرآن شریف ایک دوسرے مقام پر فردِ واحد کی نہیں پوری ایک بستی کی مثال بیان کرتا ہے:۔

وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُطْمَئِنَّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللَّهِ فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ (۱۶/۱۱۲)

اللہ ایک بستی کی مثال بیان کرتا ہے جو امن و اطمینان کی حالت میں تھی، اس میں سامانِ زیست ہر جگہ سے بافراغت آتا تھا۔ پھر اس نے اللہ کی نعمتوں کی ناقدری کی تو اللہ نے اُسے بھوک اور خوف کے عذاب کا مزہ چکھایا۔

یہی، وہ متاعِ حیٰوۃ الدنیا ہے، جو حضرت فاروقِ اعظمؓ کے سامنے آتا ہے تو آپؓ مسرت کے اظہار کی بجائے، افسردہ و غمگین نظر آتے ہیں، اور اس مال و دولت پر عبرت آمیز نگاہ ڈالتے ہیں اور آپ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ عرض کرتے ہیں کہ امیرالمؤمنین! یہ تو مقامِ تشکر تھا آپ رونے کیوں لگے؟ اور فاروقِ اعظمؓ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ:۔

جس قوم میں دنیا کی فراوانی آجاتی ہے، اس میں رشک و حسد پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس سے اس قوم میں تفرقہ پڑ جاتا ہے، میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ہمارا حشر بھی

(باقی ہے)

اسی برگزیدہ واقعہ کو سامنے رکھیئے اور جماعتِ مومنین کی شانِ استغنا کو ملاحظہ فرمائیے کہ ہواؤں کے مخالفت میں صدیوں کا جمع شدہ مال، اپنی تمام تر نگارو فریب کشش کے باوجود، اس جماعت کی شانِ بے نیازی میں ذرّہ بھر فرق نہیں ڈال سکتا۔ عبدِ مومن، بندۂ مومن صفات ان تمام اشیاء کو اپنے ہاتھ سے اکٹھا کرتا ہے۔ کمانڈر کے سامنے ڈال دیتا ہے، کمانڈر اسے مرکزِ ملت میں بھیجتا ہے۔ اور مرکز اسے جماعتِ مومنین میں تقسیم کرتا ہے، لیکن ایک سپاہی رستے لے کر خاموش رہتا ہے، کوئی بندۂ مومن، اس زینت الحیوۃ الدنیا کو خیانت آمیز نگاہوں سے دیکھنا تک روا نہیں سمجھتا۔ اس لئے کہ اسے ساقیِ دو جہان ﷺ کی چشمِ مست سے یہ رازِ زندگی سکھایا ہوتا ہے کہ:

وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ۝

معزز سامعین! قرآن کریم کے حقائق و معارف، تاریخی نوشتے اور اس جہانِ رنگ و بو میں انقلاب آفریں افراد و تحاریک کے تذکارِ جلیلہ اور ان کی کامیابیاں اس حقیقتِ کبریٰ پر شاہد ہیں کہ جب کسی تحریک کے افراد کے قلوب میں جذبۂ ایمان، سوزِ دروں، منزلِ مقصود کا تعین اور جذبۂ عمل پیدا ہوتا ہے تو پھر بے زری اور مادی سہاروں کی کمی اس تحریک کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل نہیں ہو سکتی، جب وہ اپنے پروگرام پہ عمل پیرا ہونے کے لئے دل کے پورے سوز و گداز کے ساتھ مصروفِ جہد و تاز ہوتے ہیں اور پھر ان کی نصرت و اعانت اور طمانیتِ قلب کے لئے کائناتی قوتیں ان کی ہم رکابی کی سعادت حاصل کرنا چاہتی ہیں۔

اقبال علیہ الرحمۃ نے فرمایا تھا کہ:

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ!

صاحبِ صدر! جب بتانِ وہم و گماں کو توڑ کر لا الٰہ الا اللہ کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے تو پھر ایک مردِ مومن کے لئے نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ، اس کے لئے اپنی صلاحیتوں کے پرکھنے کا معیار بن جاتا ہے۔ پھر اس کی بے زری، استخلاف فی الارض میں تبدیل ہو جاتی ہے اور بے بضاعتی و بے سرو سامانی مبدل بہ تسخیرِ ارض و سما ہو جاتی ہے۔ طوبیٰ لہم و حسن مآب۔

تحریکِ طلوعِ اسلام بھی اپنی بے زری، بغیر کسی جائیداد و اوقاف کے، محض جذبۂ عشق و مستی، سوزِ دروں اور للّٰہیت کی مے سے سرشار چند دیوانوں کے ایمان بالقرآن کے سہارے رواں دواں، تیز تر گامزن منزل ہا دور نیست کا نغمۂ سفر الاپتی، تکالیف و مصائب اور مخالفتوں کو برداشت کرتے ہوئے، این و آں سے بے نیاز، چوٹی کے کہسار کی طرح، جانبِ منزل

رواں دواں ہے ملت کی پرشکوہ صراطِ مستقیم کا ہر ذرّہ پر فشاں راہ ایک۔ سرودِ سرمدی الاپ رہا ہے، جس سے کوہ و دمن گونج رہے ہیں۔ اور وہ نغمہ ہے۔ کہ

زوالِ بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

اور پھر اس صدائے بازگشت میں، مفکرِ قرآن جناب علامہ پرویز صاحب بانیٔ تحریک، اور ان کی ہم رکابی کا شرف حاصل کرنے والا ہر فردِ کارواں، میرِ کارواں سے بیک زبان ہو کر یہ پکارتا ہوا سوئے منزل جا رہا ہے کہ ؎

چہ دست و پا نہیم کہ ہنوز از فزونِ عشق
سوداست در سرم کہ بہ ساماں برابر است

## ۷۔ صالحہ نغمی

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے — زوالِ بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

صدرِ محترم، اور حاضرینِ کرام۔ السلام علیکم

علامہ اقبالؒ کا یہ شعر جو ہمارے آج کے مذاکرے کا عنوان ہے۔ اس لحاظ سے بہت غور طلب ہے کہ یہ اس گہری سازش کو بے نقاب کرتا ہے جو صدیوں سے ہمارے معاشرے میں پنپتی چلی آ رہی ہے۔ یہ اس فریب کا پردہ چاک کرتا ہے جو سالہا سال سے ایک مخصوص گروہ اکثریت کو دیتا چلا آ رہا ہے۔ آیئے: آج ہم اس شعر کی صداقت کو اپنی سمجھ، تجربے اور مشاہدے کی کسوٹی پر پرکھیں اور آج کے دور میں اس کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

آئے دن اس قسم کی خبریں اخباروں میں آتی رہتی ہیں کہ فلاں گھر میں ہزاروں کی چوری ہو گئی ۔۔۔ فلاں جگہ ڈکیتی کی واردات ہو گئی۔ کسی گاؤں میں معمولی تنازعے پر قتل ہو گیا۔ کسی کو اغوا کر لیا گیا۔ کسی کی جیب کٹ گئی۔ کہیں دو افراد نازیبا حرکات کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ الغرض آجکل کے اخبارات میں ایسی خبروں کی بھرمار ہوتی ہے جن کو پڑھ کر انسان ذہنی الجھن اور بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے اس کا ذہن اس معاشرتی پراگندگی کو گوارا نہیں کرتا۔ لیکن یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور ہم ایسی خبریں سننے پر مجبور ہیں۔ جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے اور اس کا ذمہ دار کون ہے تو لامحالہ میرا ذہن اس کے کرنے والوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور ہم اس غریب و نادار نچلے طبقے کو قوم کے زوال کا سبب ٹھہراتے ہیں جس کے افراد چوری، اغوا اور قتل کے جیسے جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ہمیں معاشرے کے رستے ہوئے ناسور نظر آتے ہیں، اور ہم انہیں سوسائٹی کے دامن پر بدنما داغ سمجھتے ہیں۔ گداگری، بیماری اور جہالت بھی ہمیں اسی طبقے سے وابستہ

دکھائی دیتی ہے اور گداگری کی بدترین لعنت بھی انہی لوگوں پر مسلط نظر آتی ہے چنانچہ ہم ان کے وجود کو معاشرے پر ایک بوجھ سمجھتے ہوئے یہ سوچتے ہیں کہ اگر یہ نہ ہوتے تو ہمارا معاشرہ کس قدر صاف ستھرا اور مہذب ہوتا۔ نہ ان کے بدصورت جھونپڑے شہروں کے حسن کو برباد کرتے، نہ ان کے میلے کچیلے وجود ہماری نظروں پر بار ہوتے اور نہ ہی ان کے جرائم معاشرے کے زوال کا سبب بنتے۔

لیکن حاضرین کرام! حکیم الامت علامہ اقبالؒ کا یہ شعر ہمیں بتلاتا ہے اور اقبالؒ نے یہ بات پورے وثوق سے کہی ہے کہ امتِ مسلمہ کے زوال کا سبب یہ غریب اور نادار طبقہ نہیں ہے، بلکہ اس کا سبب تو کچھ اور ہے جسے بقول شاعر ہم خود سمجھتے ہیں ـــــ یہی نکتہ اس فریب اور سازش کا پول کھولتا ہے جس کے ہم ازمنہ دراز سے شکار ہیں۔ یہیں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ بیچارے زر طبقے کو موردِ الزام ٹھہرایا جا رہا ہے یہ ایک بہت بڑا دھوکہ ہے۔ زوالِ امت کا سبب کچھ اور ہے جس کو منظر عام پر لانے کی اشد ضرورت ہے ـــــ تو پھر آیئے ـــــ اصلیت کو پہچانیں اور خود کو تباہی و ذلت کی اس دلدل سے نکالنے کی سعی کریں جس میں ہم بہت حد تک دھنس چکے ہیں۔

یہ تو آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے معاشرے کا ایک حصہ بالائی طبقہ کہلاتا ہے یہ امراء و رؤسا، تجار، جاگیردار، مل مالکان، افسران اور علماء پر مشتمل ہے جن کا ہم احترام بھی کرتے ہیں اور جن سے ہم دبتے بھی ہیں۔ ان کو ہم اُمت کے قافلے کے رہنما سمجھتے ہوئے انہی سے معاشرے کے متوقع عروج کی امیدیں باندھتے ہیں۔ لیکن اگر آنکھیں کھول کر دیکھا جائے تو انہی معززین، انہی محترمین اور انہی بڑے لوگوں کو ہم بہت سے جرائم میں ملوث پائیں گے۔ انہی میں ہمیں بڑے بڑے ذخیرہ اندوز، بلیک مارکیٹئے اور رشوت خور نظر آئیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ پانچوں انگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں اور ہر زردار کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس طبقے کی اکثریت ایسے مجرمین کی ہے جو کسی طرح بھی قابل معافی نہیں ہیں لیکن ان کے بیشتر جرائم پہ پردہ پڑا رہتا ہے۔ اسی پردے کے پیچھے حاضرین کرام! یہ لوگ وہ وہ کچھ کرتے ہیں جس کا عام آدمی کو سان گمان بھی نہیں ہوتا۔ حصولِ زر ان کی زندگیوں کا مقصدِ اولین ہوتا ہے جس کے لئے یہ کسی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ہر وہ حربہ آزماتے ہیں جو ان سے بن پڑتا ہے۔ عوام کی صحت خطرے میں پڑ جائے تو ان کی بلا سے انہوں نے تو اشیاء میں ملاوٹ کرنی ہے سو کریں گے۔ انہوں نے تو جعلی دوائیں بیچنی ہیں سو بیچیں گے۔ عام آدمی اناج کو ترس جائے تو انھیں کیا؟ انہوں نے تو ذخیرہ اندوزی کر کے بھاؤ بڑھانے ہیں سو بڑھائیں گے۔ ہزاروں مزدوروں کی زندگی خطرے میں پڑ جائے تو وہ جانیں۔ یہ تو ذاتی مفاد کے لئے تالہ بندی چاہتے ہیں سو وہ ضرور ہوگی اور یہ تو نسبتاً چھوٹے جرائم ہیں حاضرین! انہی بڑے لوگوں میں ہمیں وطن کے بدترین دشمن یعنی سمگلر بھی ملتے ہیں جو لاکھوں کا مال سرحد پار پہنچا کر ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے اور اپنی تجوریاں بھرنے میں

دن رات مصروف ہیں۔ انہی مجرمی ہتھکنڈوں کے بل بوتے پر یہ لوگ اپنے لئے عیش و عشرت کا
زیادہ سے زیادہ سامان فراہم کرتے ہیں۔ فیشن ایبل کالونیوں میں عالیشان کوٹھیاں تعمیر کرواتے ہیں۔
سڑکوں پر نئے نئے ماڈلوں کی کاریں دوڑاتے ہیں۔ اور ان کی عورتیں ملبوسات اور زیورات سے بن ٹھن کے
سوسائٹی میں دندناتے پھرتے ہیں۔ ان کی زندگیاں تو آسائش اور نمائش و عشرت کی فراوانی کی ایک مکمل
تصویر پیش کرتی ہیں۔ یہ مجرم استحصال کی بنیادوں پر تعمیر شدہ ایک ایسی جنت میں بستے ہیں جس کی
چکا چوند نظروں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ یہی ظاہری حسن و آرائش ان کے عیوب اور جرائم کی پردہ پوشی
میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اپنے جرائم کو چھپانے کے لئے یہ لوگ کچھ ایسے ہتھکنڈے
استعمال کرتے ہیں جن کے ذریعے وہ عام آدمی کو نہایت آسانی سے بے وقوف بنا لیتے ہیں۔ یہی تو
ہیں جو بڑی بڑی رقم عطیات کی صورت میں حاجت مندوں کی "نذر" کر دیتے ہیں۔ یہی تو ہیں
جو جا بجا مساجد اور سکول تعمیر کرواتے ہیں!

لیکن یہ بھی تو دیکھئے حاضرین! کہ یہ تمام دولت ان کے کل سرمائے کا کتنا چھوٹا حصہ ہوتی
ہے۔ ان کروڑپتیوں کی اصل دولت تو انکم ٹیکس سے چھپا کر رکھا ہوا وہ کالا دھن ہوتا ہے جو
بڑے بڑے سینما اور شاپنگ سنٹر بنانے کے کام آتا ہے۔ تو صدر محترم! یوں یہ چھپے مجرم
معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل کرتے ہیں اور اختیار و اقتدار بھی۔ اور یوں معاشرے میں یہ اپنے
ناپاک قدم اس مضبوطی سے جما لیتے ہیں کہ ان کی ذات اور ان کے سرمائے دولت کو تحفظ حاصل
ہو جاتا ہے۔ انہوں نے ایسے پیچدار راستے بنائے ہوتے ہیں کہ ارتکاب جرم کے لئے بھی یہ
غریبوں کو استعمال کرتے ہیں۔ اپنے غریب کارندوں کو موقع واردات پر بھیج کر خود چھپ بیٹھے
ڈوری ہلاتے رہتے ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ پکڑے وقت میں ہمیشہ ہی کارندوں پر ہی پڑتا ہے۔
یہ امرا انہیں سے جرائم کرواتے ہیں۔ انہیں کو پکڑواتے ہیں اور خود صاف چھوٹ جاتے
ہیں۔ تو حاضرین محفل! آپ نے دیکھ لیا کہ ذرا غور کرنے پر زوال امت کا اصل سبب سامنے
آجاتا ہے۔ یہ بے شمار دولت مندوں کی وہ خود غرضی اور حرص و ہوس ہے جو ان سے بڑے
بڑے جرائم کا ارتکاب کروا کر انہیں امیر تر اور بے زروں کو غریب تر کرتی چلی جا رہی ہے۔
اور ستم یہ ہے کہ امت کے زوال کا الزام ان سیٹھوں پر کبھی نہیں آتا۔

رہا یہ اعتراض کہ سب غریب معصوم فرشتے نہیں ہوتے۔ آخر اخبارات میں ان کی بابت جو
خبریں چھپتی ہیں وہ سب جھوٹ کا پلندہ تو نہیں۔ یہ دلیل درست اور بجا ۔۔۔ لیکن یہ بھی تو
دیکھئے کہ ان افلاس زدہ لوگوں کے جرائم کے محرکات کیا ہیں؟ ذرا غور کیجئے تو یہ آپ کو مجبوری اور بے بسی
کے پیکر نظر آئیں گے۔ سوچئے کہ جسے سیدھے سبھاؤ دو وقت کی روٹی نہ ملے وہ کہاں سے
کھائے! جسے تن ڈھانپنے کو دو کپڑے نصیب نہ ہوں وہ ستر پوشی کیسے کرے؟ غریبوں کے جرائم
کا اعتراف کرتے ہوئے بھی ہم انہیں زوال امت کا ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتے۔ مگر ظلم کی انتہا تو یہ ہے

کہ ان کی چھوٹی سے چھوٹی غلطی بھی ان کے لئے طوفان کھڑا کر دیتی ہے۔ ہر قسم کی دھتکار۔ ذلت و رسوائی اور گالی گلوچ سے ان کو نوازا جاتا ہے۔ ہماری روش ہی ایسی ہو گئی ہے کہ ہم انہیں اپنے سے کمتر مخلوق سمجھتے ہیں۔ زرخرید غلام کی حیثیت دیتے ہیں اور ان سے بدترین سلوک روا رکھتے ہیں۔

اسبابِ زوالِ اُمت ڈھونڈنے کے لئے ہم متوسط طبقے کو بھی اپنے گریبانوں میں جھانکنا ہوگا۔ اپنی برائیوں کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم اپنی خامیوں سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ ان کو تسلیم نہ کرنا اور خود پر اصلاح کے دروازے بند رکھنا ہٹ دھرمی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس کڑے وقت میں ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم زرداروں کی اندھی تقلید کرنا چھوڑ دیں۔ ورنہ یہ زرپرستی ہمیں کہیں کا نہ رکھے گی۔

اس بحث سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سرمایہ داری اور ہوسِ زر زوالِ اُمت کا باعث بنتی ہے۔ لیکن یہاں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ خود سرمایہ داری کہاں سے پیدا ہوئی؟ امیر و غریب کی تفریق، معاشرے میں کہاں سے آئی؟ اس سوال کا جواب برائی کی اصل جڑ کو بے نقاب کرتا ہے۔ زوالِ ملت کا حقیقی سبب وہ طبقاتی نظام ہے جس نے انسانی برادری کو بالائی، متوسط اور نچلے طبقے میں بانٹ دیا ہے۔ یہی وہ بنیادی خرابی ہے جو معاشرے میں نہایت گہری جڑیں پکڑ چکی ہے اور جس کو صرف عدل و انصاف پر مبنی اسلامی نظام ہی جڑ سے اکھاڑ سکتا ہے۔ وہ نظام جس میں نہ کوئی امیر ہے نہ کوئی غریب۔ اور جس میں سب کو بنیادی ضروریاتِ زندگی کے علاوہ، ارتقاء و نشوونما کے تمام مواقع بھی مہیا ہوتے ہیں۔

اگر ہمیں واقعی نظامِ خداوندی کو اپنا کر اپنی ڈوبتی کشتی کو بچانا مقصود ہے تو ضرورت اس بات کی ہے کہ خوابوں کی دنیا سے نکل کر ٹھوس عملی اقدامات کئے جائیں۔ ہر فردِ ملت کو بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کی جائیں۔ ملک کے بچے بچے کو تعلیم سے آراستہ کیا جائے ——— قوم کے سامنے قانونِ مکافاتِ عمل اور آخرت کا واضح اور صحیح تصور پیش کیا جائے۔ باطل عقائد اور غلط تصورات کی بیخ کنی کی جائے۔ فحش فلموں اور گندے لٹریچر کو ( B A N ) کیا جائے۔ ملی اتحاد کا احساس اجاگر کیا جائے۔ اُمت کے دوست اور دشمن کی پہچان کروائی جائے۔ اور طبقاتی تفاوت کو بتدریج کم سے کم اور بالآخر ختم کیا جائے۔

یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کرے گا کون؟ کیا ہم اپنے مقاصد کے حصول کے لئے وہی طریقہ نہیں اپنا سکتے جو چین اور کوریا جیسی منظم قومیں اپنے مقاصد کے لئے اختیار کرتی ہیں۔ کیا ہم ان سے وہ جذبہ۔ لگن۔ ولولہ۔ عزم۔ اتحاد۔ تنظیم اور یقینِ محکم مستعار نہیں سکتے۔ جس کو ہم نے کھو دیا؟

خیال رہے کہ میں صرف طریقہ کی بات کر رہی ہوں، مقاصد کی نہیں۔ مومنوں کے مقاصد تو

امت غیر مسلمہ کے مقاصد سے بہت ارفع و اعلیٰ ہوتے ہیں۔ لیکن ہم اس قدر پستی میں گر چکے ہیں کہ چینی و کوریائی اور ان جیسی دوسری قومیں ہم سے بدرجہا بہتر نظر آتی ہیں ـــــ مگر ہم سے شاید یہ بھی نہیں ہوگا! اشیائے ضرورت تو دوسرے ممالک سے ادھار لینے کے ہم عرصہ دراز سے عادی ہیں۔ لیکن قوتِ عمل ہم سے ادھار بھی نہ لی جائے گی! ـــــ نہ اپنے پاس کوئی لائحہ عمل نہ دوسروں سے سیکھنے کی چاہت ـــــ تو پھر ایک ہی ترکیب سمجھ میں آتی ہے اصلاحِ احوال کی (اگر اسے اصلاح کہہ سکتے ہیں تو) وہ یہ کہ ساری قوم کو ہپناٹائز (HYPNOTIZE) کر دیجئے۔ اس کو ایک غیر فطری نیند سلا کر حکم دیجئے کہ آج سے صالح ہو جاؤ ـــــ آج سے مومن بن جاؤ!!!

اور اگر یہ حل بھی ناقابلِ قبول ہے تو پھر چیخنا چلانا چہ معنی دارد؟ اس گریہ و زاری کا کیا مطلب؟ چھوڑیئے ان تقریروں اور مذاکروں کو ـــــ جائیے۔ اپنی خود ساختہ دنیا میں واپس لوٹ جائیے۔


## قائدِ اعظمؒ کے متعلق

اور تو سب کچھ بتایا جائے گا لیکن یہ بہت کم بتایا جائے گا کہ انہوں نے اسلام، قرآن اور اسلامی مملکت کے متعلق کیا فرمایا تھا۔ ان کے یہ ارشادات، ایک پاکٹ سائز بک لٹ

## قائدِ اعظمؒ اور طلوعِ اسلام

میں نہایت حسن و خوبی سے جمع اور مرتب کر دیئے گئے ہیں۔ اس قسم کا بیش بہا ذخیرہ آپ کو اور کہیں نہیں ملے گا۔

قیمت صرف چار روپے (علاوہ محصولِ ڈاک)

(۱)

## اسبابِ زوالِ اُمّت

اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے تھے لیکن کچھ عرصہ سے نایاب تھی۔ اس کا تازہ ایڈیشن حال ہی میں شائع کیا گیا ہے۔ اس میں اس اہم اور بنیادی سوال کا نہایت تحقیقی کشا جواب ملے گا کہ:۔

## "ہم ذلیل کیوں ہوئے"

جلدی منگوا لیجئے کیونکہ اس کے ایڈیشن جلد ختم ہو جایا کرتے ہیں۔

قیمت صرف چار روپے (علاوہ محصولِ ڈاک)

(۲)

ملنے کا پتہ

ادارۂ طلوعِ اسلام۔ گلبرگ ۲ لاہور

مکتبۂ دین و دانش۔ چوک اُردو بازار لاہور